انگاروں کا شہر
صبا مُصطفیٰ

انگاروں کا شہر

(افسانے مع خطوط)

صبا مصطفےٰ ایم اے

نامِ کتاب	انگاروں کا شہر
موضوع	افسانوں کا مجموعہ
مصنفہ	صبا مصطفےٰ ایم اے؛
تعداد	۵۰۰
ماہ وسالِ اشاعت	اپریل ۱۹۹۳ء م ۱۴۱۴ھ
قیمت	۸۰ روپئے Rs. 80/=
ناشر	صبا مصطفےٰ
کتابت	محمد شریف برکاتی آمبور (شمالی آرکاٹ)
سرورق	قیصر سرمست حیدرآباد
مصنفہ کا پتہ	۹۔ فرسٹ مین روڈ۔ سیتاما ایکسٹنشن تینام پیٹ مدراس 600 018

زیرِ اہتمام

علیم صبا نویدی ۔ مونٹ روڈ۔ مدراس 600 002

ملنے کے پتے

- مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ — دہلی، بمبئی، علیگڑھ
- مکتبۂ خاتونِ مشرق — 423۔ مٹیا محل۔ جامع مسجد۔ دہلی 110 006
- نذیر بکڈپو — ٹریلیکین۔ مدراس 600 005
- فلمی ستارے — 2936۔ ترکمان گیٹ۔ دہلی 110 006
- مکتبۂ دین ودنیا — امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ۔ (یو۔پی)

انتساب

اپنی پیاری نانی جان محترمہ و معظّمہ اشیرن بی بی (مرحومہ)

کے نام

جن کی محبت و شفقت اور بنیادی تعلیم و تربیت نے

میرے اندر ادب اور آرٹ کا ایک ایسا حسین سنگم پیدا

کیا جس نے فن اور فن کار کے رشتے کی گہرائی کو سمجھنے اور اس

کی تہ تک پہنچنے میں میری کافی حد تک مدد کی------!

غفور الرحیم مرحومہ کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے

......آمین !

صبا مصطفےٰ

ترتیب

مقدمہ

ڈاکٹر سید صفی اللہ ایم اے، ایم لٹ، پی ایچ ڈی،
ریڈر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، یونیورسٹی آف مدراس

"کوئی سوال تھا جو میرے اطراف گھوم رہا تھا۔ میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی، کچھ معلوم کرنے کی متمنّی تھی۔ شاید یہی کہ دنیا کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کائنات کو بنانے والی ایک عظیم طاقت ہے، مگر ہے کہاں؟ انسان کی تخلیق کیوں ہوئی؟ انسان کی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا زندگی دوسروں کی امانت ہے یا پھر زندگی خود جیے جانے کا نام ہے؟ .... زندگی آخر چاہتی کیا ہے؟ تشدّد؟ انقلاب؟ انتقام؟ صبر و خاموشی یا پھر قربانی .....!" (افسانہ: صدقہ سے)

یہ وہ سوال ہیں جو صبا مصطفےٰ کے ذہن میں اٹھتے ہیں۔ ان کے دل کو تڑپاتے ہیں۔ انھیں سوچوں کے دوش پہ لے اڑتی ہیں۔ جہاں ایک فکر جنم لیتی ہے اور بالآخر وہ اس نتیجہ پہ پہنچتی ہیں کہ:

"یہاں انسان نہیں حیوان نما انسان بستے ہیں جو اپنی حیوانیت کی بنا پر ساری دنیا پر قیامت ڈھا رہے ہیں، نیست و نابود کر رہے ہیں..... نسلِ انسانی کا خون کر رہے ہیں۔ ایسی خطرناک انسان سوز مخلوق کا خاتمہ یقیناً ضروری ہے۔ نہیں تو دنیا میں اسی طرح انیائے، اتیاچار اور ظلم و ستم کا بازار گرم ہوتا رہے گا۔" (سسکتی دلہن: مکتوب)

یہی وہ سوالات اور مشاہدات ہیں جنھوں نے صبا صاحبہ کے ہاتھ میں قلم تھمایا اور انھیں فن کے قالب میں منتقل کرنے پر مجبور کیا۔ چوں کہ اُن کے افسانوں کی بنیاد اُن کے سوچ، اُن کے مشاہدوں اور اُن کے احساسات کی صداقت پر قائم ہے اس لیے وہ قاری کے لیے ایک نیک پیغام اور ایک بھرپور تاثر دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے۔ وہ قاری کے دل کو نہ صرف بے چین کر دیتے ہیں بلکہ اس کے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور یہی قدر فن کا معیار ہے کہ اس طرح اُن کا فن کارِ نمایاں کی انجام دہی میں کامیاب نکل آتا ہے۔

محترمہ صبا مصطفےٰ کو اپنے قلم پر بھرپور اعتماد اور اپنے فن پر پورا عبور حاصل ہے۔ جہاں تک فن پر دسترس کا سوال ہے وہ چاہیں تو ملازمہ کی بچّی کو بھی موضوع بنا کر ایک کامیاب افسانہ تخلیق کر سکتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کا سوچتا ہوا ذہن اور دردمند دِل اور مشاہدے کی آنکھیں ہیں جو انھیں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔ دراصل اُن کے ہاں ایک فکر ہے، ایک نظریۂ حیات ہے جسے عام کرنا اپنے فن کا نصب العین بنا لیا ہے۔ آج سے بیس۲۰ پچیس۲۵ سال پیشتر انھوں نے اپنے قلم کے ذریعے

اصلاحِ فرد اور اصلاحِ سماج کا بیڑا اٹھایا تھا اور آج بھی وہ اپنے اس سفر پر اسی رفتار سے گام زن ہیں۔

اُن کے قریب قریب سبھی افسانے اصلاحی ہیں اور جہاں ایک آدھ افسانے کا غالب عنصر تفریح ہے وہاں بھی وہ کھیل کھیل میں کام کی باتیں کر جاتی ہیں کبھی کبھی تو تاثیر کے لحاظ سے حد درجہ کی شدّت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کا افسانہ "صدقہ" پڑھیئے تو محسوس ہوگا کہ اس افسانے کا ہر لفظ بول رہا ہے اور بولتے بولتے رو دیتا ہے۔

ان کے اکثر افسانوں سے ان کے مشاہدے کی تیزی اور کردار نگاری پر ان کی کامل دسترس آشکارہ ہے۔ "بہت دیر کی مہرباں....." اس قسم کے افسانوں میں سے ہے۔ یہ افسانہ کئی حیثیتوں سے اہم ہے اور مشاہدہ، انسانی نفسیات اور کردار نگاری کا بہت اچھا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ یہ بظاہر شہزاد کا المیہ ہے لیکن حقیقت میں المیہ کا شکار ممتاز ہے۔ سارا افسانہ ممتاز کے گرد گھومتا ہے اور بالآخر اسے جس انجام سے دوچار کراتا ہے وہ اس کے نک چڑھے پن، اپنی دولت پر بے جا فخر، اپنی بدصورتی کے پیدا کردہ احساسِ کمتری اور اس کے ردِّ عمل کا فطری نتیجہ ہے جو ایک بھیانک سزا سے کم نہیں۔ یہ افسانہ اس حیثیت سے بھی ایک اچھا تجربہ ہے کہ عام ہیروئینوں کی طرح اس کی ہیروئن خوب صورت نہیں بلکہ بدصورت ہے اس پہ چیچک کے داغوں نے اس کے چہرے کو اور بدنما بنا دیا ہے اور یہی بدصورتی لندن کے ماحول میں پہنچ کر ایک الگ ہی تاثیر پیدا کر لیتی ہے۔

اس افسانے میں اگرچہ کہانی ہے لیکن یہ کہانی سے زیادہ کردار

کے گرد گھومتا ہے ۔ دراصل صباؔ مصطفیٰ کے بیشتر افسانے کرداروں ہی کے گرد گھومتے ہیں اور کرداروں کے لیے ہی لکھے گئے ہیں ۔ ہوتا یہ ہے کہ ان کے ذہن میں کوئی کردار جگہ لیتا ہے ، پھر پھلتا پھولتا ہے اور جب اسے ذہن میں مزید قید رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے تو صباؔ اسے کاغذ پر اتار دیتی ہیں ۔

ان کے کرداروں میں انسان دوستی ، ہمدردی اور ایثار کا جذبہ بہ فراوانی ملتا ہے ۔ جو خود اُن کے اپنے کردار کا حصّہ ہیں ۔ درد اور اذیت کے دل ہلا دینے والے منظر ، سسکیاں ، آنسو ، آہیں ، ظلم وستم اور انیائے ان سے دیکھے نہیں جاتے ۔ ان کے دماغ میں ایک ہی سوال گونجتا ہے کہ آج مجرم اپنے بھیانک انجام جان کر بھی گناہ اور جرم سے توبہ کیوں نہیں کرتے بلکہ اُن کے قدم گناہوں کی طرف بڑھتے ہی کیوں چلے جاتے ہیں ۔ (گفتگو) اور اس کا جواب بھی ان کے پاس موجود ہے کہ دراصل لالچ اور ہوس ہے جو انہیں انجام سے اندھا کر دیتی ہے ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا انگاروں کا شہر بنی ہوئی ہے ۔ ایسے میں کون سچّا فن کار ہوگا جو شعلوں کی آنچ سے اپنا دامن بچائے نکل جائے گا ۔ اور الف لیلوی داستانوں کی خواب آور گولیوں سے خود کو اور سماج کو نیند کی آغوش میں تھپکیاں دیتا رہے گا؟ انہیں سماج سے بھی شکایت ہے ۔ اس سے بھی وہ ایک سوال کرتی ہیں کہ ایسے درندوں کے لیے سماج نے آج تک کوئی سزا مقرر کیوں نہیں کی ؟!

(انگاروں کا شہر : مکتوب)

محترمہ صباؔ صاحبہ پورٹ بلیر میں پیدا ہوئیں اور وہیں پرورش پائیں ۔ جزیرۂ اندمان کا یہ شہر صباؔ صاحبہ کی نظر میں جنّتِ ارضی سے کم نہیں

ہے۔ انڈمان کا پُرفضا ماحول، بے حد دلکش مناظر، سیدھے سادے بھولے بھالے فرشتہ صفت لوگ، پیار و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں..... آنکھیں کھولنے کے بعد صبا نے یہی سب دیکھا تھا اور ایک دن جب وہ اس فضا سے نکلیں اور کلکتہ میں قدم رکھا تو ہر کوئی سوچ سکتا ہے کہ انہیں کیسا لگا ہوگا۔! کلکتہ جہاں ہر صبح سوبربن ریلویز کے ذریعہ آدمیوں کا ایک سیلاب شہر میں داخل ہوتا ہے اور شام کو آندھی کی طرح واپس ہو جاتا ہے۔ جہاں کا ہر فرد کولہو کے بیل کی طرح اپنے کام میں جٹا ہوا، نہ کسی کو اپنے گرد و پیش کی خبر نہ کسی کو کسی سے غرض اور نہ کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت۔ کاروں کے ہارن، بسوں کی دندناہٹ، ٹراموں کی گڑگڑاہٹ سے سڑکوں کو دم لینے کی مہلت نہیں، فٹ پاتھ لوگوں سے بھرے ہوئے، کھوے سے کھوا چھلتا ہوا، لمبی چوڑی رہائشی عمارتیں، گندگی سے گھری ہوئی اور مفلسی ان کی ہر کھڑکی سے جھانکتی ہوئی! صبا لکھتی ہیں کہ اس نئے ماحول سے وہ اتنی پریشان ہو اٹھی تھیں کہ کبھی کبھی رو پڑتی تھیں۔ انہیں لگا تھا جیسے وہ دوسری دنیا اور دوسری مخلوق کے درمیان پہنچ گئی ہوں۔ صبا کا یہ احساس غلط نہ تھا۔

جب ذرا قدم سنبھلے تو انھیں ہوش آیا اور پھر تو ہر روز نہ ایک نیا واقعہ، نیا تجربہ، نیا حادثہ اور نیا منظر.... اس پر بہ حیثیت ایئر ہوسٹس اُن کے آئے دن کے تجربے...... دھیرے دھیرے آنکھوں دیکھی سچائیاں ان کے قلم کی زد میں آنے لگیں۔

لہذا جب وہ کہتی ہیں کہ ان کا افسانہ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے

تو اس کی صداقت پر ایمان لے آنے میں کوئی تحمل نہیں ہوتا۔ ان کے سبھی افسانے کسی نہ کسی صداقت کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ اس سے کبھی کبھی ان کے افسانوں میں وہ کش مکش پیدا ہو نہیں پاتی جو کہانی میں دل کشی اور ندرت پیدا کرتی ہے۔ لیکن صبا کو اس کی پروا نہیں۔ چاہے اس میں کوئی نئی بات نہ ہو، کوئی اچھوتا پن نہ ہو۔ بس نئی نسلوں کے لیے ایک پیغام ہو۔ انہیں زندگی کی سچائیوں سے روشناس کرا دے۔ بھٹکی نسلوں کو صحیح راستہ دکھا دے۔ (''احساس کا آئینہ'': مکتوب) ''احساس کا آئینہ'' کی تخلیق کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''کمسن اور نازک کلیاں جس طرح اپنے شباب پر نازاں ہو کر ہواؤں سے آنکھ مچولی کھیلا کرتی ہیں۔ مگر اپنی نادانی کی بنا پر تیز جھونکوں کے تھپیڑوں میں آکر اپنی ڈالی سے ٹوٹ جاتی ہیں اور زمین پر گر کر اپنا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتی ہیں.... بالکل اسی طرح اگر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوش سے کام نہ لیں اور جھوٹی شان و شوکت کی چمکتی دمکتی دنیا میں کھو جانے کی آرزوئیں رکھیں تو کبھی اپنی زندگی کو ایک مثالی تو کیا ایک کامیاب زندگی بھی نہیں بنا سکتے۔'' (مکتوب)

صبا کے پاس نئی نسل کے لیے نہایت اہم چیز اخلاق ہے اور اچھے برے کا شعور جو ان کے قدموں کو غلط سمت میں اٹھنے سے روک سکتا ہے اور یہ عناصر ان کے بیشتر افسانوں کی جان ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو

غلط نہ ہوگا کہ نیک کردار اور مذہب سے محبت صبا کی کم زوریاں ہیں !
جہاں مذہب کی بات آئی وہ اپنی جان نثار کرنے کو تیار اور جہاں کوئی
نیک کردار نظر آیا وہ پگھل گئیں ۔ ! ان کا بس چلے تو دنیا کی ہر لڑکی اور
لڑکے کو نیک اور دین دار بنا کر چھوڑ دیں ۔ "نجمہ" اور اس کے متعلق
مکتوب پڑھیئے گا تو میری رائے سے اتفاق کرنے میں قاری کو مطلق
تردد نہ ہوگا ۔

صبا مصطفےٰ ہندو پاک کی معروف افسانہ نگار ہیں اور تمل ناڈو
کے افسانہ نگاروں میں ممتاز و منفرد مقام کی حامل ۔ تمل ناڈو میں اُن کے ہم عصر
خواتین افسانہ نگاروں میں دو اور نام ملتے ہیں ۔ مہر طلعت آمبوری اور
امیر الضیاء..... صبا صاحبہ کی طرح محترمہ مہر طلعت آمبوری نے بہت
سارے افسانے لکھے اور انھیں ہندوستان کے متعدد اور معتبر رسالوں
میں شائع کرایا ۔ لیکن محترمہ امیر الضیا نے شاید اپنے افسانوں کی اشاعت
کی طرف خاص توجہ نہیں دی ہے ، گو اُن کا ایک ناول "عنبرین" کے نام سے
شائع ہو چکا ہے ۔ ان کے افسانے بھی موضوعات اور فن کے لحاظ سے اپنی
خاص انفرادیت کے حامل ہیں ۔ کیا ہی اچھا ہو ان کے ناول کی طرح یہ بھی
مجموعے کی شکل میں قاری کے ہاتھوں تک پہنچ جائیں !

صبا کی وطنیت سے متعلق قاری کے ذہن میں ایک سوال
یہ اٹھ سکتا ہے کہ وہ انڈمان میں پیدا ہوئی تھیں تو تمل ناڈو کی کیسے بن گئیں ؟
آپ نے سُنا ہوگا کہ لڑکی کا گھر میکہ نہیں سسرال ہوتا ہے ۔ اسی طرح اس کا
وطن بھی سسرال ہونا چاہیئے ! انڈمان صبا کا میکہ ہے اور وہ مدراس کی بہو ۔

..... گویا مدراس ان کا وطن ہوا !! ویسے دیکھا جائے تو ان کی پرورش ہی انڈمان میں ہوی تھی۔ ان کے اندر ادبی ذوق اس وقت ابھرا جب انھوں نے انڈمان سے باہر قدم رکھا اور ان کا مشاہدہ اس وقت تیز ہوا جب انھوں نے انڈمان سے باہر کی دنیا دیکھی اور ان کی قلمی زندگی کا باقاعدہ ارتقاء تو ان کے مدراس سے تعلق پیدا ہونے کے بعد ہی ہوا۔

محترمہ صبا مصطفٰی کے پیشِ نظر مجموعہ "انگاروں کا شہر" میں ان کے ۱۷ سترہ افسانے شامل ہیں اور یہ تمام افسانے میرے اندازے کے مطابق ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان لکھے ہوئے ہیں۔ یہ سبھی افسانے مطبوعہ ہیں اور ہند و پاک کے متعدد رسالوں میں جگہ پا چکے ہیں۔ اس مجموعہ کی ایک خوبی جو اسے منفرد بنا جاتی ہے وہ افسانوں کے ساتھ مصنفہ کے خطوط کی شمولیت ہے۔ یہ خطوط بہت اہم بھی ہیں اور بہت خوب صورت بھی۔ ! اہم اس حیثیت سے کہ ان سے ان کے فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے اور ان کے مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں اور خوب صورت اس حیثیت سے کہ بعض خط افسانوں پر بھاری ہیں اور اپنی جگہ پر خود ایک افسانہ ! پورٹ بلیر اور انڈمان کی خوبصورتی کو جس دلکش انداز میں پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ادب پارے ہیں۔ امید کرتا ہوں کہ ان کا یہ مجموعہ افسانوی دنیا میں ایک اضافہ سمجھا جائے گا اور ہر دل عزیزی حاصل کرے گا۔

صفی کلیم

۱۲ اپریل ۱۹۹۳ء
مدراس یونیورسٹی مدراس ۵

○

تعارف

پروفیسر محبوب پاشا

ترکی میں مصطفےٰ کمال پاشاہ کی وجہ سے جو انقلاب آیا، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ انہی دنوں اکثر قدامت پسند قبائل نے ترکی سے ہجرت کر کے مختلف مقامات کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ اسی سلسلہ میں ترکی کے مہاجرین کے ایک قبیلہ نے انڈمان نکوبار کو اپنا وطن ثانی بنا لیا۔ محترمہ صبا مصطفےٰ اسی ترک خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ انڈمان جیسے سبزہ زار میں انہوں نے آنکھ کھولی، انڈمان ہی سے میٹرک کیا، بعد میں بنارس یونیورسٹی سے بی اے، اور میسور یونیورسٹی سے یم۔ اے، (اردو) کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔

آج صبا مصطفےٰ نہ صرف ٹمل ناڈو میں بلکہ ہندو پاک کے اہل علم و ادب میں ایک ممتاز مرتبہ و مقام پر فائز ہیں۔ موصوفہ بیک وقت ایک مشہور و

معروف افسانہ نگار اور ایک بلند پایہ شاعرہ کی حیثیت سے نہ صرف عوام سے بلکہ مشاہیرِ ادب سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ صبا کی خوش قسمتی ہے کہ کیپٹن مصطفےٰ جیسے نیک کردار، بلند اخلاق اور والاجاہی خاندان کے ایک ممتاز رکن کی شریکِ حیات بن گئیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ صبا کی کامیابی میں ان کے شریکِ حیات کیپٹن مصطفےٰ کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ کیپٹن مصطفےٰ نے کبھی اِن کے فطری ذوق اور ادبی شوق کی راہ میں دیوار بننے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان کے لیے ایسا سازگار ماحول فراہم کیا کہ صبا آج ایک قدآور ادیبہ اور شاعرہ کی حیثیت سے تیزی کے ساتھ ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہیں۔

زیرِ نظر تصنیف صبا کی دوسری تصنیف ہے۔ سنہ میں صبا نے اپنے شریکِ حیات کے ساتھ ارضِ مقدس مکہ و مدینہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔ اسی سلسلہ میں ایک سفر نامہ حجاز ترتیب دی۔ جو بنام "پہاڑوں کے دامن میں" شائع ہو کر تمام اردو دنیا سے خراجِ تحسین حاصل کی ہے۔ یہ دوسری تصنیف صبا کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ہے جو منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ صبا نے اس میں وہ خطوط بھی شامل کر لیے ہیں جو مدیرانِ رسائل کو لکھے گئے تھے۔ اس حیثیت سے یہ مجموعہ اردو ادب میں اپنی نوعیت کا اولین مجموعہ ہے۔

اردو میں افسانوی ادب آج کافی ترقی کر چکا ہے۔ داستان گوئی سے اس کی ابتدا ہوی۔ ناول اور افسانہ اسی تصویر کے ترقی یافتہ پہلو ہیں۔ اس عظیم صنفِ ادب کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ لیکن افسانوی ادب کے دو

معماروں یعنی منشی پریم چند اور کرشن چندر کی خدمات کو افسانوی ادب کی تاریخ کبھی بھلا نہیں سکتی۔ ان دو معمارانِ ادب نے افسانہ نگاری کو نئی شاہ راہوں سے مانوس کروایا۔ آج اردو کا افسانوی ادب انھیں دو مشاہیر کے زیرِ بارِ احسان اور ممنونِ منت ہے۔

افسانہ کیا ہے؟ حقیقت کے عکس کے سوا کچھ بھی نہیں زندگی دو حصّوں میں منقسم ہے۔ (1) حقیقت (2) افسانہ ...... سچّا اور اچھّا فن کار وہی ہے جو افسانہ کو حقیقت کا آئینہ بنادے۔ اس فن کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ایک کامیاب افسانہ نگار، اپنا افسانہ پڑھنے کے بعد ناظر کو دعوتِ فکر و نظر دیتا ہے۔ سماج کی کمزوریوں اور اس کی خوبیوں کی تصویرکشی افسانہ کے ذریعہ کرنا کمال نہیں ہے بلکہ ایک بلند پایہ فن کار اپنے افسانہ کے ذریعہ زندگی کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھتا ہے۔ ناظر کے دل و دماغ کو متاثر کرنا اور اُسے سوچنے پر مجبور کرنا ہی ایک کامیاب افسانہ نگار کی معراج ہے۔

میرے مذکورۂ بالا بیان کی روشنی میں اگر آپ صبؔا کے افسانوں کا مطالعہ کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ آپ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ صبؔا کے خطوط اور افسانے اکثر طویل ہوتے ہیں ان کا ہر افسانہ ہمارے سماج کا آئینہ ہے۔ جس میں اچھی صورتیں بھی نظر آئیں گی اور بری بھی۔ صبؔا کے بے شمار افسانے ہندو پاک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ دلی کے ایک مقتدر ادبی رسالہ 'روبی' کے مختصر افسانوں کے مقابلہ میں دُوم آکر صبؔا

نے مختصر افسانہ نگاری کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ اور "اردو رائٹرز گلڈ بہار" سے امتیازی سند حاصل کر کے اپنے فن کی عظمت کا لوہا منوالیا۔

مجھے یقین ہے کہ ناظرین صبا کے ان شہ پاروں کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھیں گے۔ میری دعا ہے کہ : ع

"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

محبوب پاشا
امیر محل، مدراس ۲

۲۳
۱۲
۹۲

○

صبا مصطفیٰ کا تخلیقی سفر

تسنیم فاروقی ایم۔ اے،

تقسیم ہند کے بعد نئے ہندوستان کی تشکیل سے بابری مسجد کی تخریب کے اس دور تک ایک لمبا عرصہ گزرا ہے۔ جس میں آزادی اپنے مختلف زینوں پر رقص کر رہی ہے اور یہ سفرِ رقص کبھی کسی انقلاب کی شکل میں کبھی بے یقین آدمیت کے زلزلوں کے ردِ عمل میں کبھی سیاست کے نئے نئے چہروں میں کبھی جاہ و اقتدار کے حصول میں کبھی تہذیبی زوال کے سہارے اور کبھی مذہب کے نام پہ بدترین لامذہبیت کے روپ میں طے ہو رہا ہے۔ ایک جانب افراطِ زر کا رونا ہے اور دوسری طرف چٹانوں پہ دو وقت کی روٹی پر بمشکل گزارہ کرنے والا لاغر سماج پنپ رہا ہے، ایک طرف سائنس کے بلند و بام مقولے دہرائے جا رہے ہیں تو دوسری طرف تعلیم اپنے صفر (ZERO) پر واپسی کی تیاری کر رہی

ہے۔ انسانی زندگی فرسٹیشن کو اوڑھنا بچھونا بنا چکی ہے۔ دہشت گردی اور زمین کو توڑنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ کم سے کم لباس پہننے کی آرزو میں آدمی، فلمیں دماغوں کی ترتیب میں لگی ہوئی ہر طرف ٹی۔ وی کلچر کا بول بالا ہے۔ ہماری کم عمر اور نوجوان نسل کا نشو و نما اور اس کا پلان، غیر ملکی فیشن کی سُرنگ میں ہو رہا ہے۔ برہنگی اور عریانی کو ثقافت کی گاڑھی کمائی کا اعزاز حاصل ہے۔ ایسے اندھے ماحول میں ایک بڑا مسئلہ ہے اہلِ علم اور اہلِ قلم کے لیے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں کیسے انجام دیں اور معاشرے پر اس کی بربادی پر کیسے اُنگشت لگائیں اور کیا کریں۔

انارکی اور قسطائیت کے اس دشوار گزار ماحول میں بھی چند ہاتھوں میں قلم ہیں جو فضائے گمشدہ کی تلاش اور بازیافت میں آج بھی سرگرداں ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کتابوں تک ان کا ہاتھ نہیں جاتا، وقت کو سمیٹنا چاہتے ہیں مگر تفریحات کے سہارے، ہر آدمی اپنے جسم میں ایک "خانہ بدوش" بسائے پھرتا ہے۔ عام آدمی اس چیلنج کو قبول نہیں کر رہا ہے۔ مگر ہر وہ ذی حِس جس کا کوئی ماضی ہے کچھ حال ہے اور تھوڑا بہت مستقبل ہے وہ ضرور ان خرابیوں کا احساس رکھتا ہے۔ ایسے عجیب و غریب بلکہ مہیب کارواں میں ایسی بے سمتی میں کسی پُرخلوص مشعل نمائی کے بغیر، ہم ایک بالشت آگے نہیں بڑھ سکتے۔ نعروں کے شور سے چونکایا تو جا سکتا ہے، ان سے کسی مظلوم یا دکھی کی تسلی نہیں ہو سکتی۔

آج ہمارے سماج کے ہر طبقے اور ہر گروہ کو حاجت ہے متانت کی اور سنجیدہ روی کی، ادراک کی، تعلیم کی اور سب سے بڑھ کر تہذیب کی۔

تاریخ کی زبان میں یوں تو تہذیبیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔ مگر

تہذیب کا وہ رُخ جو صرف انسان سے انسان کا رشتہ مضبوط کرنے میں معاون ہوا کرتا ہے وہ ہمیں صرف ادبی رہ نمائی اور درسی تربیت سے ہی مل سکتا ہے۔ ہمارا ہندوستان گواہ ہے کہ یہاں کالی داس، امیر خسرو، رحیم خان خانان تلسی داس، کبیر داس، ملک محمد جائسی، رس خان، نظیر اکبر آبادی اور میرا بائی نے اپنے فکری رجحانات کے ذریعہ انسانی وجود کو آدرش، نجات اور قناعت کے اُجالے سے سرشار و نہال کیا۔ بے شک یہ وہ لوگ ہیں جو بجائے خود کسی درس گاہ کی مثال تھے۔ انھوں نے انسانیت کو اپنے سوچ بچار اور تیاگ سے زبردست متاثر کیا۔

یہ دورِ حاضر کا سانحہ ہے المیہ ہے کہ مورّخ، مصوّر، ادیب اور شاعر کسی زخمی سپاہی کی طرح ایک ایک کا منھ تک رہا ہے اور چہروں کی دیواریں گونگی کھڑی ہیں۔

ہمارا ملک باقاعدگی سے تیرہ زبانوں کا ملک ہے اور اس کے ہر خطّہ کا قلم اپنی زبان اور اپنی روشنائی میں عام مسائل اور کھوٹے دستورِ حیات پر سوچ سمجھ کا مطالبہ کر رہا ہے۔ اور اس کا یہ عمل صدیوں سے جاری و ساری ہے جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ تیرہ زبانوں میں ترجمانی ہو رہی ہے بلاشبہ صحیح ہے۔ مگر ان سب پر فوقیت رکھتی ہے ہندی زبان کی کارگزاری اور قند مزید کے طور پہ اردو کا دائرہ اس سے بھی وقیع و وسیع ہے کہ وہ اب بین الاقوامی کینواس کا منظر نامہ ہو چکی ہے۔ اردو کے اس بین الاقوامی منظر نامے میں اتنے بہت سے نام ہیں کہ ایک لمبی چوڑی فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں نثر اور نظم کے مسیحاؤں کی تعداد معتبر بھی ہے اور ٹھوس بھی۔

یہ اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اردو کے پاس قلم پیشہ (یعنی قلم فروش) لوگ کم ہیں جیسا کہ دنیا کی اور بڑی زبانوں کا وطیرہ ہو گیا ہے۔ اس کے پاس آج بھی قلم نواز اور قلم کنار افراد ہیں جو مخلصانہ دیانت سے افکار و مسائل کا انکشاف و حل پیش کر رہے ہیں۔ اور غالباً ایک سبب یہ بھی ہے دنیا میں اس زبان کی سُرعت رفتار کا۔

آج کی زندگی کے درد مند مسائل اور اس کے ازالے کے باوصف دنیا کی بڑی زبان انگریزی کی طرح اردو میں بھی مَرد و زَن کی حسّاس شمولیت اس کے فروغ و ارتقاء کی باعث بن چکی ہے۔ نثر ہو یا نظم، مصّوری ہو یا مجسّمہ سازی آرٹ کے ہر شعبے میں خواتین بھی قلم کو اپنا شریکِ فکر بنا چکی ہیں۔

اردو ادب میں اچھی اچھی لکھنے والیاں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کبھی عصمت چغتائی کے سراپے ہیں، کبھی قرۃ العین حیدر کے تشخص ہیں، کبھی واجدہ تبسم اور جیلانی بانو کے روپ ہیں۔ اتفاق سے معیار و اقدار کا ورثہ سب کے پاس ہے، طرزِ اظہار کے قرینے جدا ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ خواتین کی ایک خاصی تعداد ہے جو اپنے تفکرات کے ذریعہ فرداً فرداً اپنی کوئی نہ کوئی شناخت رکھتی ہے۔

مقصود سب کا مشترک ہے یعنی معاشرے کی بدصورتی دُور ہو۔ اور اُسے اُن شرطوں سے واقف کرایا جائے جن کی بدولت ایک صحت مند فضا سازگار ہوتی ہے۔ ان سب کے وہی سوئیاں چبھ رہی ہیں جو انھیں حالات نے زہر میں بجھا کر عطا کی ہیں۔

آج کی افسانہ نگار خواتین میں اور بھی بہت سے ایسے نام ہیں جن

کا ذکر کیے بغیر تاریخ ادب ادھوری رہ سکتی ہے لیکن ان کے اوصاف و خدمات کو دہرانے کے لیے طوالت درکار ہے۔

میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں صبآ مصطفٰے کے لیے تو کیوں نہ اپنی بات ان کے تعارف سے شروع کردوں۔ صبآ مصطفٰے ایک پختہ کار افسانہ نگار خاتون بھی ہیں، ادیب بھی اور شاعرہ بھی ہیں۔ اتفاق سے ادب کی سہ رنگ روش کا ملکہ حاصل ہے۔ نثر و نظم میں یکساں رسائی رکھنا اور سوچنا بہت آسان امر نہیں ہے۔ اس میں ہر رنگ کا اپنی جگہ گہرا ہونا اور منفرد ہونا ایک لائق ذکر ہنر ہے۔ ان کے یہاں فن ہے، فکر ہے اور فن کاری ہے۔ میں انہیں گزشتہ بیس برسوں سے پڑھ بھی رہا ہوں اور سُن بھی رہا ہوں۔ سُنے ہوئے عرصہ ضرور گزرا ہے مگر پڑھے ہوئے کوئی وقت نہیں بیتا۔ سُنے ہوئے میں نے اس لیے لکھا ہے کہ وہ کبھی مشاعروں میں بھی آجایا کرتی تھیں اور اس طرح ساتھ ہو جاتا تھا۔ جہاں تک پڑھنے کا معاملہ ہے تو وہ مواقع ملتے رہتے ہیں۔

مدراس کی شہری صبآ مصطفٰے ایک پوسٹ گریجویٹ اور کوالی فائیڈ خاتون ہیں۔ ان کا اسلوبِ نگارش شان دار اور باوقار ہے۔ ان کے رشحات میں ایک خاص قسم کی تہذیبی خوش بو ہے، ان کے تہ دار خیالات میں ہندی کی سرسبز وادیاں ہیں جو پامال ہو جانے پر بھی سرخرو ہو جاتی ہیں۔ یہ بات تو میں بڑے دعوے سے لکھ سکتا ہوں کہ ان کے افسانے بازار میں بیٹھ کر نہیں پڑھے جا سکتے۔ ان کے یہاں شریف تنہائیوں کی کسک ہے۔ مجبور زندگیوں کا درد ہے۔ غریب بیٹیوں کی بے چارگی ہے استحصالی طاقتوں کے خلاف بغاوت اور محسوسات کا شدید اظہار ہے

ان کے یہاں عصری نسائیت کی بڑھتی ہوی بے لگام دوڑ پر تنقیدیں ہیں۔ ان کے یہاں نئی نسل کی وہ پہلی درس گاہ جسے ماں کہا جاتا ہے اس کی صحیح نمایندگی ہے۔

موجبِ مسرت ہے کہ ان کے افسانوں کا مجموعہ "انگاروں کا شہر" ان دنوں طباعت کے دہانے پہ ہے۔ خدا کرے کہ چھپے اور ان کی شہرتوں میں مزید اضافہ کا باعث ہو جائے۔ یوں بھی ان کی مقبولیت کیا کم ہے۔ اس سے قبل ان کی اور بھی کتابیں چھپی ہیں۔ افسانوں کے علاوہ ایک رہ نما کتاب دل چسپ سفر نامے "پہاڑوں کے دامن میں" کی صورت میں حج کے تعلق سے، ایک ضخیم کتاب، اندرا گاندھی کے افکار و نظائر اور ان کی تمام زندگی سے متعلق۔

غرض کہ اپنے اس تخلیقی مشن میں وہ کامیاب بھی ہیں اور سرگرم بھی ان کی کہانیاں، ان کی تخلیقات دل چسپ، دل کش اور اثر انگیز ہوا کرتی ہیں قارئین کی پسند و ناپسند سے ان کا کوئی کاروبار نہیں۔ مضبوط اصولوں اور ادب کے خوش گوار ضوابط کی امین ہیں۔ مقصد کے ڈگر سے ہٹ کر چلنا اُن کے یہاں کفر ہے۔

خواتین کے کردار و سیرت کی سلامتی اور اخلاقی درستگی کا منشا اُن کا شیوۂ قلم ہے۔ اُن کے یہاں معاشرے کی اصلاح اور اس کے غم کا شائبہ بھرپور ہے۔

کتاب "انگاروں کا شہر" میں خصوصیت کا حامل یہ نکتہ بھی خوب تر ہے کہ وہ ہر افسانہ اپنے خطوط کی تمہیدی روشنی سے مزین

کر رہی ہیں۔ میرے خیال سے یہ اُن کا اپنا اسٹائل ہو گا۔ اور اس سے اُن کو خراجِ انفرادیت ملے گا۔

میں ہمیشہ سے ان کے مکتوبات کا معترف ہوں۔ خط لکھنا تو کوئی صبا سے سیکھے! اور آخر میں اپنے اس مصرعے پر بات ختم کرتا ہوں: کہ

ع

"اے صبا مصطفےٰ مبارک باد"

نسیم فاروقی

7.1.93

○

گفتگو

"انگاروں کا شہر" میرے ستره افسانوں کے اولین مجموعہ کا نام ہے۔ اور اس مجموعہ میں شامل ایک افسانہ کا عنوان بھی! (افسانہ "انگاروں کا شہر" جو رسالہ "روبی" کے مختصر انعامی مقابلہ نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اور جسے دوسرا انعام بھی حاصل ہوا تھا۔ (آپ یہ خیال نہ کریں کہ "انگاروں کا شہر" کو انعام ملا تھا۔) لہذا میں نے اس سے بے حد متاثر ہو کر اسے اپنے افسانوں کے مجموعہ کا نام دے دیا ہے۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔!

مجھے شروع ہی سے یہ نام بہت ہی زیادہ پسند تھا۔ جب میں نے اسے اپنے افسانہ کا عنوان دیا تھا۔ اسی وقت (میں نے) تہیہ کر لیا تھا کہ میں اپنے افسانوں کے مجموعہ کا نام "انگاروں کا شہر" ہی رکھوں گی۔ ---------- (یہ خیال مجھے اس لیے آیا چوں کہ) سچ پوچھیے تو میرے جتنے بھی افسانے اب تک شائع ہو چکے تھے اور شائع ہو رہے ہیں، ان میں تقریباً ہر دوسرا تیسرا افسانہ آپ کو انگاروں کے شہروں میں لوٹتا ہوا، تڑپتا ہوا اور دم توڑتا ہوا نظر آئے گا ——— اس لیے کہ آج وہ زمانہ تو رہا نہیں کہ قلم کار بے فکر ہو کر دل بہلانے والی دل چسپ قیاسی پریوں اور جنّوں شہزادوں اور شہزادیوں کی داستانیں لکھیں۔ بلکہ آج کا زمانہ ترقی پسندی اور حقیقت پسندی کی طرف مائل ہے۔ آج کے دور میں لوگ روز مر مر کر جیتے ہیں اور

جی جی کر مرتے ہیں۔!

میری دانست میں آج کا زمانہ انگاروں کی تپتی ہوئی بھٹی سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ اور یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم ہے کہ آج ساری دنیا انگاروں کی دنیا بن چکی ہے۔ ایسی حالت میں وہ کون سچا فن کار ہوگا جو تصوّراتی اور خیالی باتوں پر بھروسہ اور اعتماد رکھے گا ـــــــ ماضی کی کہانیاں اور داستانیں سب کچھ ماضی کی نذر ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ماضی میں بچّوں کو سُلانے اور اُن کا دِل بہلانے کے لیے پریوں اور جنوّں وغیرہ کی داستانیں سنائی جاتی تھیں، مگر آج وہ سب خواب والی باتیں ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس لیے کہ اب نہ تو اس طرح کی کہانیاں لکھنے والے رہ گئے ہیں' نہ کہنے والے اور نہ ہی سننے والے۔ ۔ ۔ ۔ !

لکھنے والے اس لیے نہیں کہ آج کا زمانہ فرضی داستانوں پر بالکل یقین نہیں رکھتا۔ حقیقت نگاری کو اپناتا ہے ـــــــ! قلم کار اپنے ملک میں جو حالات دیکھتا ہے، جو کچھ وہ اپنے اطراف دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے ان سب کو وہ اپنے ڈھنگ سے افسانوی رنگوں میں ڈھال کر عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔!

سنانے والے اس لیے نہیں رہ گئے ہیں کہ آج کے مصروف ترین دَور میں ہر انسان روٹی، کپڑا اور مکان کی جدوجہد میں اتنا الجھ کر رہ گیا ہے کہ جب وہ گھر آتا ہے تو کسی بھی طرح کچھ کھا پی کر بستر پر لیٹ جاتا ہے اور پھر نیند کی آغوش میں پناہ گزیں ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں کون کس کو کہانیاں سُنائے۔!

اور سُننے والے اب اس لیے نہیں ہیں کہ آج کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے اپنے ہوم ورکس کرتے کرتے اس قدر تھک کر چُور ہو جاتے ہیں کہ ان کے ہوم ورکس

پورے بھی نہیں ہو پاتے کہ نیند کی دیوی آ کر انھیں اپنے نرم و گداز دامن میں بھر لیتی ہے۔

اب آپ ہی بتائیں کہ اس ہنگامی اور ترقی پسند، تشدد پسند اور دہشت پسند دور میں کس کو فرصت ہے کہ کوئی کسی کا حال بھی اطمینان سے بیٹھ کر پوچھے ——! آج ہر جگہ ہما ہمی کا دور ہے۔ ایسے عالم میں ایک قلم کار جو کچھ دیکھتا ہے، محسوس کرتا ہے، جو کچھ اس کے مشاہدات ہوتے ہیں، تجربات اور جذبات ہوتے ہیں ان سب کو وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی کہانیوں میں پریوں اور جنّوں والی دلچسپیاں اور دل لبھانے والی باتیں نہیں ہوتیں۔ یہ افسانے آج کے انگاروں نما سماج میں تپتے ہوئے، بلبلاتے ہوئے اور تڑپتے ہوئے، انسانی زندگیوں کی حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں پیچیدہ مسئلے ہوتے ہیں، پریشانیاں ہوتی ہیں۔ دکھ، درد اور تکلیفوں کے دل ہلا دینے والے مناظر ہوتے ہیں۔ سسکیاں، آنسو اور آہیں ہوتی ہیں۔ ظلم و ستم، اَنیائے و اَتیاچار، خون خرابے، قتل و غارت گری، بے ایمانی لوٹ مار ——! اور پھر بھیانک انجام —— !! مگر سب سے بڑی حیرت اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ آج مجرم اپنا بھیانک انجام جان کر بھی گناہ و جرم سے توبہ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے قدم گناہوں کی طرف بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

لالچ و ہوس نے انسان کو اس قدر بے خوف و نڈر بنا دیا ہے کہ مجرموں کی تعداد دن بدن ترقی پذیر ہوتی جا رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کا ہر فن کار اپنے اپنے ڈھنگ اور طریقے سے دنیا میں ہونے والے واقعات اور حادثات کا نقشہ کھینچتا ہے۔ لہذا "انگاروں کا شہر" بھی ان ہی دل ہلا دینے

والے واقعات سے آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے مجموعہ کا نام "انگاروں کا شہر" رکھا۔

بہرحال! زیرِ نظر مجموعہ کو بہت پہلے یعنی آٹھ، نو سال قبل زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظرِ عام پر آجانا چاہئے تھا۔ مگر اس کی طباعت کے بارے میں بھی ایک اچھی خاصی لمبی داستان ہے۔ اگر میں یہاں سنانے لگوں تو پوری کتاب اس کہانی سے بھر جائے گی۔ مگر پھر بھی میں یہاں مختصراً بیان کر دینا اس لیے ضروری سمجھتی ہوں کہ آپ قارئین کو بھی معلوم ہو جائے کہ ایک قلم کار کو اس کی تخلیقات کی اشاعت کے لیے کیسی کیسی مشکلوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ اس کا اظہار چند لفظوں سے قطعی ناممکن ہے۔!

بہرحال! میرے افسانوں کے مجموعہ کی اشاعت کے بارے میں سب سے پہلی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ میں نے اس سلسلے میں کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں تھا۔ حالاں کہ میرے پڑھنے والوں نے، میرے دوست و احباب اور رشتہ داروں نے یہاں تک کہ ادبی اداروں سے وابستہ شخصیتوں نے بھی اکثر مجھ سے میرے مجموعہ کے بارے میں پوچھا کہ میں اپنے افسانوں کا مجموعہ کب شائع کروا رہی ہوں ۔ !

جب جب بھی مجھ سے اس طرح کے سوالات کیئے جاتے تھے تب تب میں اندر ہی اندر بہت پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ یہ محسوس کر کے کہ میرے خیر خواہوں کو میرے افسانوں کے مجموعہ کے بارے میں فکر ہے، مگر مجھے اس کی فکر بالکل نہیں ہے ـــــ لہذا ایسے موقعوں پر میں اپنے آپ سے وعدہ لے لیا کرتی کہ اس سال میں مجموعہ کو کسی بھی حال میں شائع کرادوں گی ۔

اور پھر گھر آکر میں افسانوں کو یکجا کرنے میں لگ جاتی۔ مگر اکثر یہ میری کم نصیبی ہی رہی ہے کہ جب جب بھی میں نے افسانوں کے مجموعوں کی اشاعت کی تیاریاں شروع کیں عین اسی وقت کوئی نہ کوئی اس سے بھی زیادہ ضروری اور اہم کام میرے سامنے آجاتا تھا اور مجھے مجبوراً مجموعہ کو جوں کا توں شیلف میں پھر سے بند کردینا پڑتا۔ یہاں میں زیادہ نہیں چند خاص خاص واقعات کا ذکر کرنا چاہونگی۔

وہ زمانہ 1982ء کا تھا۔ اس وقت تک میرے پچاس سے زائد افسانے ہند و پاک کے مقتدر جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ لہذا "خاتونِ مشرق" کے مدیرِ اعلیٰ جناب عبداللہ فاروقی صاحب (مرحوم) نے کئی بار مجھ سے کہا کہ میں مجموعہ کو جلد سے جلد ترتیب دے کر طباعت کے لیے بھیج دوں۔ لہذا میں اپنے شائع شدہ افسانوں کو جمع کرنے میں مصروف ہو گئی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بے حد افسوس اور حیرت ہوئی کہ میرے پاس صرف چند ہی رسالے رہ گئے ہیں، جن میں میرے افسانے چھپے تھے۔ باقی کے رسالے غائب تھے۔ لہذا میں ان اداروں کو جن کے ذریعہ میرے افسانے شائع ہوئے تھے خطوط لکھنے میں مصروف ہو گئی۔ تاکہ گم شدہ رسالے مجھے ان سے حاصل ہو جائیں۔ .... اتنے میں میرے شوہر نواز نے مجھے یہ خوش خبری دی کہ ہم دوسری بار عمرہ و زیارت کے لیے حجاز کی سرزمین پر جا رہے ہیں۔ یہ سُننا تھا کہ میں مسرت سے ہمکنار ہو کر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی اور مجموعہ کی تیاری کا کام رُک گیا۔!

دوسری بار جب میں مختلف ادبی اداروں سے افسانوں کو جمع کر کے ترتیب دے رہی تھی کہ وہ زمانہ 30 ر اکتوبر 1984ء کا تھا اچانک مجھے یہ خبر ملی کہ مسز اندرا گاندھی کا اساسینیشن (ASSASINATION) ہو گیا ہے۔

یہ سُنتے ہی میرا مجسم وجود لرز گیا۔ میں حیرت زدہ رہ گئی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ میں نے سُنا ہے وہ صحیح ہے۔ مگر انسان کب تک سچائی سے دُور بھاگ سکتا ہے۔ مجھے بھی آخرکار اس سچائی کا اعتراف کرنا ہی پڑا، اور پھر مسلسل تین دنوں تک میں ٹی۔ وی۔ پر مسز گاندھی کی آرتھی کو اپنے آنسوؤں کے ساتھ دیکھتی رہی ـــ اس وقت میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں اردو میں ان پر ایک کتاب تحریر کروں گی۔ جس میں اُن کے آبا واجداد سے لے کر ان کی پیدائش اور پھر اُن کی مکمل زندگی کی عکاسی ہوگی۔ یہ ارادہ میں نے اس لیے کیا کہ میرے دِل کے خانوں میں مسز گاندھی کی جدائی کا غم بُری طرح حاوی تھا۔ اس لیے کہ مسز گاندھی میری آئیڈیل ہیں۔ میں ان کی فین ہوں۔ وہ میری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ میں نے اپنے بچپن کے ایام سے ہی اُن سے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے۔ اور بہت کچھ حاصل کیا ہے۔......اُن دنوں جب پنڈت جواہر لال نہرو ہمارے ملک کے وزیرِ اعظم تھے اور شریمتی اندرا گاندھی اپنے والد کے ہمراہ ہر وقت نظر آتی تھیں۔ میں اُن سے بہت متاثر تھی۔ میری یہ زبردست خواہش تھی کہ میں ان سے ملوں مگر یہ میری کم نصیبی ہی تھی کہ میں آخر تک اُن سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کرسکی۔

بہرکیف ـــ! جب میں نے سُنا کہ مسز گاندھی اب ہمارے درمیان نہیں رہیں تو میں نے ان پر ایک کتاب لکھنے کا فیصلہ کرلیا اور اس فیصلے کے ساتھ ہی میں نے ان پر لکھی ہوئی مختلف کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کردیا چوں کہ میں جلد سے جلد کتاب کو منظرِ عام پر لانے کی خواہش مند تھی۔ لہٰذا اس طرح یہاں بھی افسانوں کا مجموعہ ترتیب ہوتے ہوتے رہ گیا ـــ!

تیسری بار میں نے تقریباً اپنے بارہ افسانوں کو جمع کرلیا تھا

اور انھیں ترتیب وار سجا رہی تھی کہ اتنے میں مجھے پورٹ بلیر انڈومان کی سرکار کی جانب سے دعوت نامہ ملا کہ میں 26 جنوری 1985ء کے مکمل پروگرام کو ویڈیو میں کور [COVER] کروں ۔ وقت بہت کم تھا۔ لہٰذا مجموعہ کو پھر شیلف میں بند کرکے میں پورٹ بلیر (انڈمان) کے لیے پرواز کر گئی ......!

چوتھی بار مجموعہ کو کسی بھی طرح مکمل کرنے کا میں نے عہد کرلیا تھا، مگر اچانک 1990ء میں ہم نے حج کے لیے جانے کا ارادہ کرلیا وہ زمانہ رمضان المبارک کا تھا۔ لہٰذا عبادت گزاری اور حج کی تیاریوں میں مجموعہ کو نظر انداز کر دینا پڑا۔

پانچویں بار "انگاروں کا شہر" کسی بھی طرح مکمل تو ہو گیا بس دہلی جانے کا پروگرام بنانا تھا.... گھریلو الجھنیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ انسان جو کرنا چاہتا ہے، وہ کر نہیں پاتا اور جو نہیں کرنا چاہتا ہے وہ اچانک ہو جاتا ہے اور پھر ہم عورتوں کے لیے تو قدم قدم پر دقتیں اور دشواریاں درپیش ہوتی ہیں۔ میرے سامنے بھی بے شمار رکاوٹیں آڑے تھیں۔ ہر ایک کا سامنا کرتے کرتے بھی تو وقت لگ جاتا ہے.... بس اس انتظار میں کہ اگلے ماہ دہلی جانے کا پروگرام بناؤں گی اور اس طرح کئی ماہ گزر گئے اور پھر اچانک مدراس فلم انڈسٹری کے چند لوگ میرے ہاں آئے اور مجھے ایک تمل فلم ڈائرکٹ کرنے کی پیشکش کی۔ اس سے پہلے میں پورٹ بلیر کے لیے دو ڈاکیومنٹری اور تین چھوٹی چھوٹی ویڈیو فلمیں انڈومان کے آرٹسٹوں کو لے کر بنا چکی ہوں۔ اس کے بعد فلم بنانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ جس کے لیے مجھے ساؤتھ

انڈین ڈائرکٹرس اسوسئیشن سے ڈائرکٹر کا ممبر شپ کارڈ حاصل کرنا تھا۔لہذا
یں نے اپنے مختصر تعارف کے ساتھ عرضی دے دی۔ اس کو دیکھ کر چند لوگ
میرے پاس آئے اور انھوں نے ڈائریکشن کا آفر دیا۔ یں نے خوشی سے قبول
کرلیا۔چوں کہ تین ۳ مہینہ کے اندر اندر فلم کو مکمل کرنا تھا لہذا "انگاروں کا شہر"
پھر ایک بار فائل یں دب گیا۔

بہر حال — ! یہ حقیقت اپنی جگہ مصمم ہے کہ ہر کام کا ایک وقت
مقرر ہوتا ہے اور جب تک اس کا وقت نہیں آجاتا تب تک خواہ کیسی ہی
اور کتنی ہی کوششیں کی جائیں کامیابی نصیب نہیں ہوتی —— "انگاروں
کا شہر" کی طباعت کا وقت نہیں آیا تھا لہذا اسے بار بار فائل سے باہر آنا
اور پھر فائل کے اندر دبے رہنا پڑتا تھا۔ ..... مگر جب وقت آیا تو ایسا
کہ مجھے بھی حیرت یں ڈال دیا۔

ہمارے اکلوتے بیٹے اسلم کو دہلی یں ایک ٹیسٹ یں بیٹھنا
تھا۔ لہذا کیپٹن صاحب نے کہا کہ ہم دوسرے ہفتہ دہلی جا رہے ہیں آپ
"انگاروں کا شہر" بھی ساتھ لے لیں۔ ایسا موقع بار بار نہیں آتا۔ مجموعہ کے
شائع ہونے کے اچھے آثار نمایاں ہیں۔ ورنہ آپ کوئی نہ کوئی دوسرے کاموں
یں مصروف ہو کر مجموعہ کے ساتھ بہت بے اعتنائی برتتی ہیں —— یں
نے جب یہ سُنا تو فوراً غیر ارادی طور پر میری زبان پر فلمی گیت کا ایک
مصرع آگیا۔ ! ع

"آپ نے یاد دلایا تو مجھے یاد آیا"

اور پھر میں نے "انگاروں کا شہر" فائل سے نکال کر بکس یں احتیاطاً

رکھ دیا۔ تاکہ پھر کہیں مجموعہ کے ساتھ ناانصافی نہ ہوجائے۔

بہرکیف ۔۔۔! میری یہ برسوں کی تمنّا رہی ہے کہ میرے افسانوں کا مجموعہ جب شائع ہو تو اس میں کچھ انفرادیت ہو، اس کی آراستگی اور ترتیب میں کچھ نیاپن ہو، کچھ الگ تھلگ ہو۔ کچھ مختلف اور نئے انداز و بیان کے ساتھ مجموعہ قارئین کے سامنے آئے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہر قلم کار اپنی تخلیق کے ساتھ ایڈیٹر کو ایک خط ارسال کرتا ہے۔ ہر قلم کار کے خط کی نوعیت اور اندازِ بیاں الگ الگ ہوتا ہے۔ کوئی مختصر تحریر پہ اکتفا کرتا ہے تو کوئی طویل خط لکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ اس زمرے میں میں بھی شامل ہوں۔ میں عموماً طویل خط ہی لکھتی ہوں اور ان خطوط کی نقلیں بھی میرے پاس رہ جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دو بار یکے بعد دیگرے گر جانے سے میرے دائیں ہاتھ جس سے میں لکھتی ہوں ایک ہی جگہ دو بار فریکچر ہوا جس کی وجہ سے اب ہمیشہ میرے دائیں ہاتھ میں درد کی شکایت رہتی ہے اور جب میں لکھتی ہوں تو ایسی حالت میں تحریریں شکستہ خاطر ہوجاتی ہیں۔ اس لیے کہ جس رفتار اور تیزی سے دماغ سے مضمون فریم ہوکر نکلتا ہے، اتنی تیزی اور رفتار سے میرا ہاتھ لکھ نہیں پاتا۔ رک رک سا جاتا ہے مگر دماغ نہیں رُکتا اور نہ تھکتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دماغ سے نکلا ہوا مضمون اتنا شان دار، جان دار اور شائستہ ہوتا ہے کہ ہاتھ سست رفتاری کی وجہ سے اُسے فوراً نہیں لکھ پاتا۔ جو

جملے دماغ سے ایک بار آکر نکل جاتے ہیں اگر انھیں فوراً نوٹ نہ کیا جائے تو دوبارہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی بالکل ویسے ہی جملے حاصل کرنا ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ اور پھر پچھتانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا ہے۔ لہذا میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے میں دماغ سے نکلے ہوئے سارے مضامین کو شارٹ ہینڈ میں لکھ لیتی ہوں اور پھر بعد میں انھیں آہستہ آہستہ فیر کرتی ہوں۔ بس یہی وجہ ہے کہ میرے پاس خطوط اور افسانوں وغیرہ کی نقلیں رہ جاتی ہیں۔

خیر ــــ! جیسا کہ میں نے اوپر درج کیا ہے کہ میرے خطوط زیادہ تر طویل ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ میں ان میں حسبِ عادت اور حسبِ ضرورت بہت کچھ اپنے اطراف کے حالات کے بارے میں اور افسانوی کرداروں کے بارے میں لکھتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے خطوط پڑھنے کے بعد بہت سے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ "آپ کا خط بھی ایک افسانہ ہی ہوتا ہے ـــــ آپ اپنے خطوط کا مجموعہ بھی ضرور نکالیں۔"

اس طرح ایک دو نہیں بلکہ بہتوں نے مجھے رائے دی۔ جن میں چند کے نام جو مجھے یاد ہیں ذیل میں تحریر کر رہی ہوں۔

میرے استادِ محترم نثار احمد نثارؔ سنگری صاحب (مرحوم) جنھوں نے میرے اندر کی ادبی صلاحیتوں کو ابھارا اور مجھے ایک ادیبہ اور شاعرہ بننے کا فخر عطا کیا ــــ!

میرے چچا خسر محترم محبوب پاشا محبوبؔ جو میرے استاد بھی ہیں اور میرے خیر خواہ بھی ــــ! جن کے نیک مشورے ہمیشہ میری رہبری کرتے

رہتے ہیں۔

گوپامؤ لکھنؤ کے محترم نثار احمد فاروقی صاحب (مرحوم) جو میرے استاد بھی تھے اور میرے شوہرِ محترم کی طرف سے ہمارے خاص رشتہ دار بھی ۔۔! میرے اوّل الذکر استاد نثار احمد نثار نگری صاحب کے انتقال کے بعد مجھے آپ سے شعر و ادب کی خدمات حاصل کرنے کا سنہرا اور مبارک موقع حاصل ہوا ۔۔۔ یہ آپ کی تربیت اور تعلیم کا ہی نتیجہ ہے کہ میرا ادبی ذوق دن بدن پروان چڑھتا گیا۔

محترم عبداللہ فاروقی صاحب (مرحوم) مدیرِ اعلیٰ "خاتونِ مشرق" جن کی شفقت اور گراں قدر رائے کی میں ہمیشہ ممنون رہوں گی۔

میرے پیارے ابّا جان محترم خان صاحب جناب الفت خان (مرحوم) اور میرے پیارے ابّا خسر محترم نواب جی اے عبدالقادر صاحب (مرحوم) ان دونوں کی یادیں میرے شعر و ادب کی روحوں میں سمائی ہوئی ہیں۔

میری شفقت سے معمور پیاری امّی جان محترمہ حلیمہ بی بی صاحبہ (اللہ ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم و دائم رکھے۔ آمین۔) کی ادبی اور مذہبی تعلیم و تربیت نے مجھے شعر کہنے اور افسانے تحریر کرنے کی صلاحیتیں بخشیں ۔۔۔ میرے افسانوں کے زیادہ تر کردار ان کے مرہونِ منت ہیں۔

میرے ماموں خسر محترم نواب محمد محمود صاحب (مرحوم) اور اُن کے فرزند محترم نواب اکرام محمود صاحب ایڈوکیٹ نے قدم قدم پر میرے ذوق و شوق کو ابھارا اور میری بے حد ہمت و حوصلہ افزائیاں کیں۔!

محترم تسنیم فاروقی صاحب لکھنوی ۔ محترم حبیب ہاشمی صاحب

کلکتوی - محترم احساس گونڈوی صاحب (مرحوم) - محترم ثقلین صاحب
کلکتوی - میرے بھائی اسماعیل خان صاحب ہمارا بیٹا اسلم مصطفیٰ اور
میرے محترم شوہر کیپٹن بی لے مصطفیٰ صاحب ــــ اور دیگر... !

ان تمام معزز اور مکرّم شخصیتوں کی گراں قدر آراء پر میں نے تہیّہ
کرلیا کہ میں اپنے خطوط کا بھی مجموعہ منظرِ عام پہ لے آؤں گی ــــ !

جب میں اپنے افسانوں کو ترتیب دے رہی تھی تو اس وقت
مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ افسانوں کے ساتھ ان خطوط کو بھی شامل کرلوں جنہیں
میں نے افسانوں کے ساتھ رسالوں کے مدیران کو لکھے تھے۔ میں نے اپنا یہ خیال
اپنے شوہر کو بتایا تو انہیں یہ خیال بہت پسند آیا۔

اس کے علاوہ افسانوں کے ساتھ خطوط کی اشاعت کا
Inspiration مجھے "بیسویں صدی" سے حاصل ہوا۔ 'بیسویں صدی'
میں قلم کاروں کی تخلیقات کے ساتھ ساتھ ان کے خطوط بھی شامل ہوتے
ہیں۔ یہ طریقہ اور انداز مجھے اس لیے بھی بہت پسند آیا کہ فن کاروں کی تخلیقات
سے پہلے ان کے خطوط نظر سے گزرتے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے قارئین کو فن کار
کے بارے میں بہت کچھ معلومات فراہم ہوجاتی ہیں اور قارئین کی دلچسپی
بھی برقرار رہتی ہے ــــ !

بالآخر " انگاروں کا شہر" بڑی لمبی اور خاردار مسافت طے
کرنے کے بعد اب یہ آپ معزز قارئین کے پیشِ نظر ہے۔ اُمید ہے
مطالعہ کے بعد آپ اپنی گراں قدر رائے سے ضرور نوازیں گے۔ کہ
" انگاروں کا شہر" کا نیا انداز اور نئی ترتیب و آراستگی آپ کو کیسے لگی۔!

آپ اپنی پسند کا اظہار بلا جھجک کریں۔ آپ کی صحیح رائے کی میں قدر کرتی ہوئی اس پر عمل کرنے کا فخر حاصل کروں گی۔ !

شکریہ !

صبا جعفری

۱۹ر اگست ۱۹۷۶ء

کلکتہ

محترمی رحمان نیّر صاحب!

آداب و تسلیمات!

ایک ہفتہ قبل آپ کا گرامی نامہ نظر نواز ہوا۔ خیریت معلوم ہوئی۔ ویسے بھی کیپٹن صاحب جب بھی دہلی جاتے ہیں تو وہ آپ سے ملاقات ضرور کرتے ہیں۔ مگر اِن دنوں وہ دس پندرہ دنوں سے دلّی کی فلائیٹ نہیں کر رہے ہیں ورنہ افسانہ کب کا اُن کے ہاتھوں ارسال کر چکی ہوتی

بہرکیف "دیوار" کو میں نے مکمل کرلیا ہے۔ بس اس خط کے پورے ہوتے ہی پوسٹ کردوں گی۔

"دیوار" کی اپنی ایک انفرادیت ہے، جو مجھے بہت پسند ہے۔ اُمید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔........... ایسا ہوتا ہے کہ لوگ انتقام کی آگ میں جل کر یہ بھول جاتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط! مگر کچھ ایسے بھی حساس، عقل مند، تجربہ کار اور انسانیت نواز کردار اس دنیا میں موجود ہیں جو اپنے اوپر ہوئے ظلموں کو محض ایک اتفاق اور مقدّر کا لکھا ہوا سمجھ کر بھول جاتے ہیں.....!

انتقام تو وہی لیتے ہیں جو ناسمجھ، جذباتی اور بے صبر ہوتے ہیں اور جن کو اپنے اوپر اور اپنی سچّائی پر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ لفظ "انتقام" پر یقین کرتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جس لفظ کا مطلب ہی تباہی اور بربادی ہے، جس میں انتہاپسندی اور تشدّد پسندی کا رنگ بھرا ہوا ہے بھلا ایسا شرپسند لفظ یعنی انتقام کیوں کر

کسی کو سکون کی زندگی عطا کر سکتا ہے۔

بہر طور! "دیوار" کی ہیروئن کا کردار بہت جاندار اور متاثر کن ہے۔
کاش! ایسی شخصیتیں ابھر کر سامنے آتی رہیں تو کیا عجب کہ دنیا میں انسانیت کا بول بالا ہو جائے۔ آپ بھی پڑھ لیں اور اپنی گراں قدر رائے سے نوازیں۔

پچھلے خط میں میں نے لکھا تھا کہ میں دلی آ رہی ہوں۔ مگر پروگرام ایک ماہ کے لئے ملتوی ہو گیا ہے۔ ـــــــ راؤ الفضلا اور بھوبھنیشور سے مشاعروں کی دعوتیں آئی ہیں۔ سوچتی ہوں چلی جاؤں۔ تجربہ بھی حاصل ہو جائے گا اور مشق بھی جاری رہے گی۔ چوں کہ ابھی تک مجھ میں اسٹیج فیئر باقی ہے۔ اُمید ہے چند اور مشاعرے پڑھنے کے بعد یہ ڈر بھی جاتا رہے گا ـــــــ میری یہ بڑی تمنّا ہے کہ میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر سامعین کے سامنے بغیر کسی جھجک کے اشعار پڑھوں اور اُن سے مخاطب ہوں۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو موتی لال نہرو، سروجنی نائیڈو اور مسز اندرا گاندھی کی طرح اسٹیج پر کھڑی ہو کر تقریریں کروں، لوگوں کو اچھی اچھی باتیں بتاؤں۔ سماج سیوا کا بڑا شوق اور جذبہ دل کے اندر موجزن ہے۔ یہ صرف شوق تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ میں عمل بھی کر رہی ہوں۔ مگر ہاں! خاموشی سے ـــــــ اپنے ملک اور عوام کی خدمت کرنے کا جذبہ میرے اندر آج سے نہیں بلکہ بہت پہلے سے موجود ہے۔
جب میں اسکول میں پڑھ رہی تھی اور مسز اندرا گاندھی کو اپنے والد کے ساتھ ملک اور عوام کی خدمت کرتے ہوئے تصویروں میں دیکھا کرتی تھی۔ ان دنوں ٹی۔ وی۔ کی ایجاد تو ہوئی نہیں تھی۔ بس ریڈیو میں ان کے بارے میں سنا کرتی تھی اور اخبارات میں اُن کے بارے میں بہت کچھ شایع ہوتا رہتا تھا پڑھا کرتی تھی ـــــــ مسز گاندھی

سے میرا بچپن بہت ہی زیادہ متاثر تھا اتنا کہ آج بھی میں شریمتی اندرا گاندھی کو اپنے
دل و دماغ سے جدا نہ کر سکی، بلکہ میری بندگی میں اور اضافہ ہونے لگا ہے۔ انھیں
میں نے اپنے لئے ایک مثال بنا لیا ہے۔ اس لئے کہ مجھے بہادر، دلیر، ذہین، قابل اور
اپنے وطن پر نثار ہونے والی شخصیتیں بہت ہی زیادہ متاثر کرتی ہیں اور مسز گاندھی
بلا مبالغہ غیر معمولی ذہن کی مالک اور مقناطیسی کردار کی ایک جاذب نظر معزز لیڈر رہیں۔
وہ ایک بہت ہی قابل سیاست داں سوجھ بوجھ رکھنے والی تجربہ کار اور ہندوستان جیسے عظیم
ملک کی اوّلین خاتون وزیرِ اعظم ہیں۔ مجھے یقیناً ان پر بڑا فخر ہے۔

رحمٰن بھائی! معاف کرنا! میں نے آپ کا بہت قیمتی وقت لے لیا ہے
جب آپ کا خط آتا ہے تو اس میں صرف چند سطریں ہی درج ہوتی ہیں۔ میں نے ہمیشہ
آپ سے شکایت کی کہ آپ اتنے مختصر خط کیوں لکھتے ہیں۔ مگر آپ نے اپنا انداز نہیں
بدلا اور میں ہر بار کوشش کے باوجود بھی اپنی روش کو چھوڑ نہ سکی۔ مجھے اپنے انداز بیان
اور تحریر کی طوالت کو دیکھ کر کبھی کبھی بڑی کوفت ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی تو ایسا بھی
ہوتا ہے کہ خط کی طوالت کی وجہ سے سارا دن ایک ہی خط میں گزر جاتا ہے۔ اس وقت
مجھے اپنے آپ پر بڑا غصّہ آتا ہے اور میں ایسی حالت میں یہ تہیہ کر لیتی ہوں کہ آئندہ اتنا
طویل خط نہیں لکھوں گی۔ صرف کام کی باتیں ہی تحریر کروں گی۔ مگر افسوس کہ میں اپنے
آپ سے کئے ہوئے وعدوں کو وفا کرنے سے ہر بار قاصر رہتی ہوں...... شاید یہ
دماغ کی کارستانی ہی ہے اور ہاتھ بے چارے کی کیا مجال کہ وہ اپنی مرضی کا اظہار کرے
بہر حال! اب تو میں یہیں پر نوکِ قلم کو روک لیتی ہوں۔ ورنہ یہ
سلسلہ ختم ہونے سے رہا.......... ارے باپ رے.......
معاف کریں چلتے چلتے ایک اور خاص کام کی بات یاد آ گئی۔ گھبرایئے گا

نہیں! مختصر سی بات ہے۔ دو سطروں ہی میں پوری ہو جائے گی ——— پچھلے دو ماہ سے رسالہ "روبی" کا دیدار نہیں ہوا۔ براہِ کرم رسالہ پابندی سے ارسال کریں تو رسالے کے مطالعہ میں بھی پابندی قائم رہے گی۔

اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔

یہاں سب ٹھیک ہے۔

خلوص کار

صبا صدیقی

دیوار

"خبردار! اگر تم دونوں نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ......"

"دیدی تم!" ان دونوں کی آنکھوں میں حیرت اور خوف شامل تھا۔

"ہاں میں! اس لڑکی کو چھوڑ دو۔" وہ بولی

"بھگوان کے لئے دیدی یہاں سے چلی جاؤ"۔ وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"ہرگز نہیں۔ تمہیں اتنی ذلیل حرکت کرتے شرم نہیں آتی؛ بے شرمو کسی کی بہو بیٹی کو زبردستی اغوا کر کے اس کی آبرو لوٹنا کہاں کی بہادری ہے۔ میں کہتی ہوں، تم دونوں ابھی اور اسی وقت یہاں سے باہر نکل جاؤ"۔ غصہ میں چیختے ہوئے آشا کی آواز بھرا گئی۔

"نہیں دیدی! ایک مدت کے بعد نہ جانے کتنی تدبیروں سے تو یہ دن آیا ہے۔ ہم نے قسم کھائی تھی کہ جب تک ہم اپنی آشا دیدی کی بے عزتی کا بدلہ نہیں لے لیں گے سکھ کی نیند نہیں سوئیں گے"۔ ان دونوں کے لہجے میں ایک عزم تھا۔

"کیسا بدلہ! کیسی قسم؟ ایک طرف تم مجھے دیدی کہتے ہو، ماں مانتے ہو اور اسی ماں کے گھر میں ایک معصوم لڑکی کی عزت برباد کرنے پر تلے ہو؟"

"نہیں دیدی! ہمیں غلط نہ سمجھو۔ یہ وہی لڑکی ہے جس کے بھائی نے آپ کی ....." اتنا کہہ کر وہ دونوں رونے لگے۔

"ہاں! ہاں بولو اب زبان کیوں رک گئی"، آشا دھاڑی ....

"دیدی" لمبی خاموشی کے بعد ان میں سے ایک بولا : "اس لڑکی کا بھائی دو سال پہلے آپ کی زندگی برباد کر کے لندن چلا گیا تھا نا۔ اسی وقت ہم نے قسم کھائی تھی ایک دن آپ کی بربادی کا انتقام ضرور لیں گے۔ یہ لڑکی اس ذلیل شخص کی بہن ہے۔"

ایک پل کے لئے آشا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر کچھ دیر کے لئے وہ دو سال پہلے کی دنیا میں لوٹ گئی۔

دو سال پہلے وہ شہر کی مشہور لیڈی ڈاکٹر تھی۔ اُن ہی دنوں ایک رات ..... کسی کا فون آیا کہ "ایک مریض صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ فوراً آئیے۔"

رات کافی بیت چکی تھی! لیکن آشا نے گیراج سے گاڑی باہر نکالی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مطلوبہ جگہ پر پہنچ گئی، لیکن جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی دروازہ اندر سے بند ہو گیا اور جب دروازہ دوسری بار کھلا تو اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ قانون اس درندے کو اپنی گرفت میں لیتا وہ ملک چھوڑ کر فرار ہو چکا تھا۔

اچانک کسی کے رونے کی آواز نے آشا کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

"ہوں تو یہ تم ہو، اس مکّار انسان جگل کشور کی بہن۔" آشا کی جذبات سے عاری آواز سن کر اس کے سامنے کھڑی لڑکی تھرا گئی۔

اب آشا اس لڑکی کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ چند لمحوں تک آشا اس کے ستے ہوئے چہرے اور خوفزدہ آنکھوں کو تکتی رہی۔ پھر آشا کے ہاتھ آگے بڑھے! اور اس نے لڑکی کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

پھر وہ لڑکی اچانک آشا کے قدموں پر گر پڑی۔ اجے اور وجے حیرت سے اپنی بہن آشا کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن آشا ان دونوں کی حیرانی سے بے خبر اس لڑکی کو سہارا دیئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

دروازے کے پاس پہنچ کر آشا نے پلٹ کر کہا ! .... "جاؤ اگر ہمت ہے، اس درندے سے انتقام لو۔ اس کم زور اور بے بس لڑکی سے تمہیں کیا ملے گا ؟"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا..... اور آگے بڑھ کر لڑکی کے جسم سے اُتاری ہوئی ساری اس کے نیم عریاں جسم پر ڈالتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ••

۴ر اکتوبر سنہ ۱۹۷۷ء
کلکتہ

رحمٰن نیّر بھائی صاحب !

خلوصِ فراواں !

ایک حقیقت کو افسانہ کا رُوپ دے کر بھیج رہی ہوں۔ یہ افسانہ کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ ——————— امید ہے افسانہ کا کلائمکس آپ کو پسند آئے گا ——!

اپنی گراں قدر رائے سے نواز کر ممنون فرمائیں !

نیازمند
صبا مصطفیٰ

گھونگھٹ

بارش کی رم جھم ہلکی ہلکی پھوہاریں لان پر بچھی ہوئی سبز گھاس کی چادر پر موتیاں بچھا رہی تھی ۔ سامنے پائیں باغ کی کیاریوں میں جا بجا شاداب گلاب مُسکرا رہے ہیں۔ ہوا کے سرد اور چنچل جھونکے اُنھیں بار بار چھیڑ کر گدگدا رہے ہیں۔ کتنا خوشگوار موسم اور اس پہ پھُولوں کے رنگوں کا امتزاج قدرت کے انوکھے شاہکار کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

میرا دل اُداس اُداس ، بُجھا بُجھا قدرت کی رعنائیوں کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ سرد ہوا کے جھونکے میرے سارے وجود کو سرد کر چکے ہیں۔ لیکن مجھے سردی کا احساس تک نہیں۔ پلکوں کی نازک جھالروں میں موتیوں کی لڑیاں لٹک کر کچھ فرش پر گر گئی ہیں اور کچھ پلکوں کی ریشمی چلمن میں جذب ہو کر دم توڑ چکی ہیں خنک ہوائیں سرسراتی ہوئی میرے بالوں کی لٹوں کو بار بار میرے اداس اور مغموم چہرے پر گرا رہی ہیں۔

گھر کا سارا ماحول خوشیوں کے دامن میں لپٹا ہوا جا بجا عورتوں اور بچّوں کی عجیب سی آوازیں ماحول میں بکھر کر رہ جاتی ہیں۔ ایک طرف دُلہن کے کمرے میں سہاگ کے گیتوں کی مترنّم آواز گونج رہی ہے۔ ہر طرف رنگ برنگے تازہ پھولوں اور چھوٹی چھوٹی رنگین بتّیوں سے گھر کی فضا بے حد خوشگوار ہو رہی ہے۔

آپا بہت خوش ہیں سہیلیوں کی جھرمٹ میں خوشی خوشی اپنے ہاتھوں

میں سہاگ کی سرخ چوڑیاں پہن رہی ہیں۔ سہیلیاں اُن سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں اور آپا کے گورے گورے گال شرم سے گلاب کی طرح سرخ ہو کر دہکنے لگتے ہیں۔ آپا بار بار شرم سے اپنا خوب صورت چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپا لیتی ہیں۔

آج آپا سچ مچ پری معلوم ہو رہی ہیں۔ بہت خوش ہیں۔ اُن کا وجود کتنا پُرسکون نظر آ رہا ہے۔ آج تو سارا جہاں اُنھیں حسین معلوم ہو رہا ہے۔ کیوں نہ ہو آج آپا کی تمنا جو بر آئی ہے۔ اُنھیں اُن کا اسلم جو مل گیا ہے۔

اسلم ؟!...... ہاں !...... اسلم ؟!........ یہ نام میرے دل کو بے قابو اور بے قرار کر رہا ہے اور پھر میرے کانپتے ہوئے لبوں میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلم ! واقعی انسانیت کا ایک زندہ پیکر ہے۔ جس نے صرف میری خوشی کے لئے سب کچھ قربان کر دیا۔

اُس دن بھی اسی طرح بارش کی پھواریں لان کے زمرّدیں فرش پر بوندوں کے موتی بکھیر رہی تھیں۔ سامنے وہی شاداب گلاب اپنا حُسن لٹا رہے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے میرے پورے وجود کو گدگدا رہے تھے۔ یہ منظر کتنا روح پرور تھا، کتنا فرحت افزا تھا۔ کاش اُس وقت یہ موسم، موسمِ بہار نہ ہوتا موسمِ خزاں ہوتا تو مجھے کچھ احساس ہی نہ ہوتا۔ میں اسی طرح جس طرح آج اِس جگہ کھڑکی کے پاس کھڑی بارش کی رم جھم برستی پھواروں سے لطف اندوز ہو رہی تھی، کہ اچانک کسی کی مترنم آواز میرے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہ آپا تھیں جو میرے ہاتھ میں ایک تصویر دیکھ کر فوراً لوٹ گئیں۔ میں حیرت سے آپا کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور پھر تصویر کو، کس کی تصویر؟ جب حیرت بھری نگاہوں سے تصویر کو اُلٹ پلٹ کر میں نے دیکھا، میری رُوح کی گہرائی میں ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ جسے میں سنبھال نہ سکی اور میرے دل کی ناؤ ناخدا کے بغیر اُس گہری کھائی

کے دہانے میں ڈوب گئی۔ میری روح مجروح ہو کر تڑپنے لگی کراہنے لگی۔

چند منٹ جس موسم گل کی خوشگوار فضا سے متاثر ہو کر اسلم کی یاد میں کھو گئی تھی اب وہی سہانا موسم اور رم جھم کرتی ہوئی پھواریں میرے دل پر ہتھوڑے مار رہی تھیں اور سرخ رنگوں کے گلاب دہکتے ہوئے شراروں کی طرح معلوم ہونے لگے۔ پلکوں کے سایے تلے آنسوؤں کے موتیوں کا خزانہ تھا۔ اور پھر مجھے معلوم نہیں کب یہ بارش تھمی، کب مطلع صاف ہوا۔ ہاں اتنا ضرور یاد تھا کہ بجلی بہت زور سے چمکی، بادل گرجے اور پھر میں کھڑکی بند کر کے اندر کمرے میں آ کر اپنی مسہری پر دراز ہو گئی۔

آخر کار میری سسکتی ہوئی مجبور اور معصوم محبت نے اسلم کو آپا سے شادی کرنے پر راضی ہی کر دیا۔ اُس دن اسلم بہت اداس تھا۔ اور روندھی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا — "ترانہ! تم میری زندگی ہو! میری روح ہو! اس روح کی اتھاہ گہرائیوں میں تمہارے معصوم پیار نے پناہ لی ہے۔ میرے دل کے چمن پر تمہارا اور صرف تمہارا راج ہے۔ تم وہاں کی ملکہ ہو، رنگ برنگے خوب صورت پھولوں کی تم ہی رانی ہو۔ کوئی اور اس دل کے چمن میں نہیں رہ سکتا۔ تم مجھے مجبور نہ کرو۔" اور پھر اس کی کرب ناک آواز مدھم پڑ گئی۔ مگر اسلم! میں کسی بھی حالت میں آپا کو ناخوش نہیں دیکھ سکتی۔ انھوں نے مجھے کبھی محسوس نہ ہونے دیا کہ میں ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوں۔ ماں بن کر مجھے آپا نے ماں اور باپ کا بھی بھرپور پیار دیا اور میری ہی خاطر انھوں نے اب تک شادی نہیں کی۔ اگر آپا شادی کر لیتیں تو آج میں کس طرح ایم۔ اے تک تعلیم یافتہ کہلاتی؟ مجھے کون پڑھاتا؟ کون سہارا دیتا؟ تم ہی بتاؤ اسلم! جہاں انھوں نے اتنی ساری قربانیاں صرف میری ایک ذات کے لئے دیں کیا میں اب اُن

کی خوشی کے لئے ایک چھوٹی سی قربانی بھی نہیں دے سکتی؟

میں اسی طرح ایک بھکارن کی طرح کاسہ لیے اس سے اپنی آپا کی خوشی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ کاسہ یوں ہی خالی پڑا رہا۔ اس کے اندر صرف میرے آنسوؤں کے موتی دمک رہے تھے۔ ہاں اسلم نے اتنا ضرور کیا کہ اُن تابناک موتیوں کو اپنے دامن میں بھر لیا۔ لیکن پھر بھی اس کا دامن خالی ہی رہا۔

وہ سکتے کے عالم میں یوں ہی حیران نگاہوں سے مجھے تک رہا تھا۔ اُس کی پلکیں مضطرب تھیں اور آنکھوں کے صدف میں چند جھلملاتے ہوئے موتی چمک رہے تھے۔ پھر اُس کے لب ہلے۔ اس کا کرب آمیز درد ماحول میں گونجا ایسا معلوم ہوتا تھا کہیں دُور بہت دُور کسی نے برہا کا درد بھرا گیت بانسری میں چھیڑ دیا۔

"ترانہ! اگر یوں ہی مجھے تنہا چھوڑنا ہے تو صرف تنہائی کی سوغات ہی سے نواز دو۔ میں اکیلے تمہارا درد برداشت کر سکتا ہوں۔ تمہاری یاد سے پیار کر کے ساری عمر یوں ہی گزار سکتا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے میری اس ویران زندگی پر یہ ظلم و ستم نہ کرو۔ اپنی آپا سے شادی کرنے کے لیے مجبور نہ کرو ترانہ!۔ ورنہ ...... ورنہ ...... !"

اور وہ ادھوری بات کہہ کر بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔ میں نے خلاء میں اپنی نظریں جما دیں۔ اس کی رندھی ہوئی درد بھری آواز میرے سینے کو چھلنی کر رہی تھی۔ کاش میں اسلم کو اپنا سکتی اور آپا سے صاف صاف کہہ سکتی۔

"آپا! جس اسلم کو آپ چاہتی ہیں وہ میری زندگی ہے! میری روح ہے! وہ کبھی آپ کو نہیں چاہ سکتا! آپ دونوں ایک ساتھ ایک کالج میں پڑھاتے ضرور ہیں لیکن کبھی اُس نے آپ کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا جو آپ سمجھتی ہیں۔ وہ تو پہلے ہی دن کالج میں مجھے اپنی بنا چکا تھا۔ میں بھی اس سے فلاسفی پڑھتے وقت اُسے اپنے دِل میں

جگہ دی چکی تھی ۔ پھر ہماری محبت آہستہ آہستہ پروان چڑھنے لگی ۔ آپ نے اسے غلط سمجھا ! دراصل وہ میرا ہی قرب حاصل کرنے کے لیے آپ کے قریب آیا تھا اور آپ نے اُس کا یہ روپ دیکھ کر کتنا بھیانک مطلب نکالا آپا جان ! اس طرح دو نازک دل ٹوٹ جائیں گے ۔ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی روح کی گہرائیوں سے چاہا ہے ۔ اب تو یہ پیار اتنا استوار اور مستحکم ہو گیا ہے کہ اِس کا ٹوٹنا یا مڑ کر لوٹ جانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے ۔ اب موت ہی اس کا حل ہے۔

لیکن میں نے آپا کے جذبات ، اُن کی زندگی اور خوشی کی خاطر کچھ نہ کہا ہاں اتنا ضرور کیا میں نے اسلم کو ایک خط لکھا ۔۔۔

اسلم !

ہم ایسے موڑ پر آپہنچے ہیں جہاں سے محبت کی منزل تو قریب ہے لیکن جتنی قریب ہے اتنی ہی بھیانک اور کٹھن ہے ۔ اُس سنسان قبرستان کی طرح جہاں کا سنّاٹا جان لیوا اور ماحول دِل ہلا دینے والا ہے ۔ جہاں سے لوٹ کر کبھی کوئی واپس نہیں آیا ۔ پھر ایسی منزل کی طرف بڑھنا بے وقوفی کی دلیل ہے ۔

محبت کی پاکیزگی کو برقرار رکھتے ہوئے ہم ایک ایسی مثال قائم کریں جس سے ہم فخر سے سر اٹھا کے چل سکیں ۔ یہ زمین ، یہ آسمان ، یہ اردگرد کا ماحول ، یہ گلاب کی شاداب کیاریاں ، یہ سبزہ زار ، گھاس کی خوب صورت چادر یہ سب ہماری بے غرض محبت کی شاہد ہیں ۔ یہ ہماری اس قربانی کو فخر کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور پھر سچی محبت قربانی بھی تو چاہتی ہے ۔ محبت اگر شادی میں بدل گئی تو محبت کی پاکیزگی باقی نہ رہے گی ۔ وہ ہوس کہلائے گی

اور وہ ایسی غلاظت میں ملوّث ہو کر کراہنے لگے گی۔ اُس محبت کو یاد کرے گی جو لیلیٰ مجنوں میں تھی، اُس اُلفت کے لیے دم توڑ دے گی جو شیریں اور فرہاد میں تھی، جو سوہنی مہیوال اور رومیو جولیٹ میں تھی۔

اسلم! اگر میری روح کی تسکین چاہتے ہو تو میری بات مان کر آپا سے شادی کرنے کی تیاریاں شروع کر دو۔ یہی ایک راہ ہے جس سے ہماری محبت پاک اور زندہ جاوید بن سکتی ہے۔ اگر تم نے صرف اپنے مفاد کے لیے ایسا نہ کیا تو سمجھو کہ میری روح تڑپتے ہوئے سسکتے ہوئے دم توڑ دیگی!"

اور انھیں چند سطروں نے اسلم کو آج آپا کا دولھا بننے پر مجبور کیا۔

مطلع صاف ہو چکا ہے شام سُرمئی چادر اوڑھ رہی ہے۔ سرد ہوائیں آراستہ دروازے، کھڑکیوں پر جل ترنگ بجا رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے یہ بھی شادی کی خوشی میں شادی کے گیت الاپ رہی ہیں۔ سامنے سڑک کی بتیاں چمک رہی ہیں ہمارا گھر بھی پُورے شباب پر ہے۔ رنگ برنگی جگمگاتی بتیوں نے زمین کو آسمان بنا دیا ہے۔ آپا عروسی جوڑا پہنے آراستہ مسہری پر بیٹھی اپنے دولھا کا بے تابی سے انتظار کر رہی ہیں۔

اچانک بہت ساری آوازوں سے میرے خیالات کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور میں گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتی ہوں......... "بارات آگئی!— بارات آگئی!! سب کی زبان پر ایک ہی آواز!

میرا دِل کانپ رہا ہے۔ سانس کے ساتھ ساتھ دِل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو رہی ہیں۔ ہاں! بارات آگئی! میں ہنگاموں کو چیرتی ہوئی آپا کے کمرے میں جاتی ہوں۔ آپا میری منتظر ہیں۔ مجھے دیکھ کر مُسکرا دیتی ہیں اور اشارے سے اپنے

پاس بُلاتی ہیں۔ پھر شکایت آمیز لہجے میں کہتی ہیں۔ "ترانہ! تم کہاں کھو گئی تھیں
میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ آؤ میرے پاس بیٹھو! اب تو ہم ایک دوسرے
سے جدا ہو رہی ہیں!" اتنا کہہ کر آپا میرے گال پر ایک بھرپور بوسہ دیتی ہیں۔ میں
بناوٹی ہنسی ہنس کر خود پر قابو پا کر آپا کے دائیں بازو جا بیٹھتی ہوں۔ یہ چھوٹی سی کائنات
خوشیوں سے کھلکھلا رہی ہے۔ سارا ماحول ہنسی اور شادمانی میں ڈوبا ہے۔ صرف میں
ہی اکیلی بجھی بجھی سی اُداس اُداس نظر آ رہی ہوں۔ اور پھر اچانک عورتوں میں ایک ہنگامہ
برپا ہوتا ہے ـــــ "مولانا صاحب تشریف لا رہے ہیں ـــ!"

یہ سنتے ہی آپا جھٹ سے اپنا زرّیں گھونگھٹ جو اوڑھ رکھا تھا، فوراً
اپنے سر سے کھینچ کر میرے اوپر ڈال دیتی ہیں اور میرا گھونگھٹ درست کرنے لگتی ہیں۔
میں گھبرا جاتی ہوں اور سکتے کے عالم میں آپا کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگتی ہوں۔ کچھ
بول نہیں سکتی۔ مولانا صاحب بالکل قریب آجاتے ہیں۔ آپا اپنے چہرے پر سکون کی ہلکی
سی مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اپنی انگلی کے اشارے سے مجھے چُپ کراتی ہیں ـــــ اور
پھر مولانا صاحب کی آواز آتی ہے ـــ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

محمد اسلم ولدِ محمد کریم کا عقد یعنی نکاح دس ہزار مہر موجّل کے عوض ترانہ کوثر
ولدِ شوکت علی مرحوم سے ہونا قرار پایا ہے۔

"ترانہ کوثر آپ نے قبول و منظور کیا۔"

آپا نے جلدی سے بے قراری کے عالم میں میرے کان میں کہا ـــ ہاں کہہ دے میری بہن
میں تو تم دونوں کا امتحان لے رہی تھی۔" میرا دل چاہا فرطِ محبت و عقیدت سے آپا کے قدموں پر سر رکھ دوں
لیکن دلہن یہ کیسے کر سکتی ہے۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں میری نظریں آپا کے قدموں پر سجدہ ریز ہوگئیں۔

۱۸ر دسمبر سنہ ۱۹۷۷ء
مدراس

محترم احساس بھائی صاحب
تسلیمات!

نئے سال کی آمد آمد ہے۔ نئے سال کی پیشگی مبارکباد قبول فرمائیے
آج ۱۸ر دسمبر ہے۔ سنہ ۷۸ء لگنے کے لیے صرف تیرہ ۱۳ دن رہ گئے ہیں۔ ایک سال پر لگا کر اڑ گیا۔ اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ پورے بارہ ۱۲ مہینے یعنی 365 دن گزر گئے۔ اور میں نے ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔ میرے سارے کام ادھورے ہی پڑے ہوئے ہیں۔ جب کہ مجھے اس وقت تک کم از کم ایک ناول اور چار پانچ افسانے تو لکھ لینا چاہیے تھا۔ مگر کچھ بھی پورا نہ ہو سکا۔

آپ کو یاد ہے پچھلے سال اسی ماہِ دسمبر میں جب ہم کلکتہ میں مقیم تھے، غریب خانے پر آپ، ثقلین بھائی اور حبیب ہاشمی بھائی بھی کھانے کے ٹیبل پہ براجمان تھے۔ آپ نے کھاتے کھاتے مجھ سے کہا تھا۔
"صبا بہن! اب آپ فوراً ناول لکھنا شروع کر دیں۔"
اس وقت میں یہ سن کر بہت زور سے ہنسی تھی۔ آپ سب کو حیرت ہوئی کہ

میں ہنس کیوں رہی ہوں ۔ پوچھنے پر میں نے بتایا ۔ کہ
"میرے پاس وقت ہی کہاں ہے؟" آپ نے کہا:
"بھئی! آپ ملازمت پر باہر تو جاتی نہیں! گھر پر رہتی ہیں۔
آپ کے پاس وقت ہی وقت ہے۔" یہ سننے کے بعد میں اس وقت،
کچھ سنجیدہ خاطر ہو گئی تھی ۔ جواب دیا:
"میں سروس نہیں کرتی، بجا ہے، مگر گھر پر رہ کر اتنا کچھ کرنا
پڑ رہا ہے کہ مجھے لمحہ بھر کی بھی فرصت نہیں ملتی کہ میں میکے اپنے والدین کو
دو سطریں لکھ کر ان کی خیریت معلوم کروں!"
پھر میں نے مفصل بتانا شروع کیا اور صبح سے شام تک کی
اپنی مصروفیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:
"مجھے گانے کا شوق ہے۔ میں جناب بڑے غلام علی خان صاحب
مرحوم کے صاحب زادے جناب منوّر علی خان صاحب سے موسیقی کی تعلیم
لے رہی ہوں۔ روزانہ صبح 8 بجے جاتی ہوں اور دس بجے واپس آتی ہوں
آتے ہی باورچی خانے میں چلی جاتی ہوں۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے پکوان میں
صرف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اسلم کو کھانا کھلا کر سلاتی ہوں۔ حالاں کہ
سندھیا اسلم کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ مگر میں چھوٹے بچّے کو دوسروں کی
دیکھ بھال میں پورے طور پر نہیں چھوڑ سکتی۔ اسلم کے سونے کے بعد ہم سب
دستر خوان پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد فوراً اپنی
رائیٹنگ ٹیبل پر چلی جاتی ہوں۔ اگر کوئی نیا رسالہ آیا ہے تو اس کا کچھ
دیر مطالعہ کرتی ہوں۔ یا پھر ادھورے افسانے کو مکمل کرنے میں مصروف ہو جاتی

ہوں۔ اسی درمیان اگر طبیعت کی رفتار غزل گوئی کی طرف مائل ہوئی تو پھر ایک غزل کے چند شعر بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ شام پانچ بجے تک چلتا ہے۔ (ان میں نماز کے اوقات کا ذکر اس لیے نہیں ہے کہ ان دنوں میں نماز کی پابند نہیں تھی۔ مگر اب خدا کا شکر ہے کہ نماز کی پابندی آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں صبح سے رات تک کے اپنے اوقات کی تقسیم آپ کو بتا رہی ہوں تو اوقاتِ نماز کا ذکر نہ کرتے ہوئے دل کو ایک ٹھیس سی لگتی ہے۔)

بہرکیف! پانچ بجے چائے سے فارغ ہوتی ہوں اور ریاض کرنے میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ تقریباً 8 بجے چھٹکارا پاتی ہوں۔ پھر باورچی خانے کا رُخ حسبِ معمول! اور پیٹوں کی آگ بجھانے کی جدوجہد میں رات دس بج جاتے ہیں۔ اس کے بعد اگر طبیعت نے اجازت دی تو کچھ لکھتی ہوں ورنہ گیارہ بجے بستر پہ دراز ہو جاتی ہوں۔۔۔۔۔!

ہاں! اگر بیچ میں مہمان آجاتے ہیں تو میرے معمولات میں زبردست خلل پڑتا ہے۔ پھر تو وقت ہی نہیں ملتا کہ میں پڑھائی لکھائی یا پھر موسیقی پر توجہ صرف کروں! اب آپ ہی بتائیے کہ میں ناول کیسے تحریر کروں۔! وہ بھی ایک سال میں دو۔۔۔۔! باپ رے باپ۔۔۔۔۔!'

آپ نے میری ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا:

"آپ ایک ہی کا ارادہ کر کے ناول شروع کر دیں۔ اس بات کا خیال رکھیے کہ ناول زیادہ بڑا نہ ہو۔ سمجھ لیں کہ آپ کے دس افسانوں کی ضخامت کا ہو۔۔۔۔ آپ کوشش تو کریں۔۔۔ آپ کے پاس اتنے اچھے موضوعات ہیں۔

آپ کم زور نہ بنیں۔ بس ہمت کر کے شروع ہو جائیں۔ دیکھئے آپ کس طرح سال میں دو ناولوں کو جنم دے سکتی ہیں۔"

میں نے آپ کی رائے کی قدر کرتے ہوئے بس اتنا ہی کہا:

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی ۔۔ !"

آج پورا ایک سال ختم ہونے کو آرہا ہے۔ میں نے دو ناول تو خیر دور کی بات ہے دو افسانے بھی تحریر نہیں کئے۔ اس لیے کہ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، اگر مہمان آجائیں یا پھر اچانک کوئی بہت ہی ضروری کام سامنے آجائے تو پھر میرے معمولات میں خلل پڑ جاتا ہے۔ ہوا یہ کہ نوازؔ کا تبادلہ اسی سال کے اوائل میں مدراس ہو گیا۔ وہ بھی اچانک! اس تیاری میں کلکتہ سے مدراس آنا اور پھر مدراس جیسی نئی جگہ پر نئے سرے سے گھر بسانا اور سنوارنا کوئی معمولی کام نہیں! اس میں پورے دو تین مہینے صرف ہو گئے۔ خدا خدا کر کے نئے گھر کے حالات ذرا معمول پہ آ ہی رہے تھے کہ اتنے میں پورٹ بلیر سے اور پھر بعد میں امریکہ سے میرے رشتہ دار آگئے۔ ان کی مہمان نوازی کے بعد انہیں سیر و تفریح کے لیے باہر لے جانا اور پھر سب سے بڑا دردِ سر کا کام شاپنگ کروانا...... ان ساری مصروفیات میں میرا سارا وقت نکل جاتا تھا....... اس کے علاوہ میں نے دو مشاعروں میں بھی اسی سال شرکت کی۔ بس اس طرح یہ پورا سال میرے لیے بیکار ہی ثابت ہوا......

خیر! اگلے سال یعنی آج سے تیرہ دنوں کے بعد میں ناول لکھنا شروع کروں گی ان شاء اللہ! تاکہ آپ کو کوئی شکایت نہ رہے۔

لیجیے! ..... "وعدے کی عظمت" ارسالِ خدمت کر رہی ہوں۔

..... جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میرے ہر افسانہ کی بُنیاد حقیقت پر ہوتی ہے۔ مگر "وعدے کی عظمت" کی بزرگی یہ ہے کہ پورے افسانے کی چار دیواری سچائی کی اینٹوں سے رکھی گئی ہے۔ یعنی مجسّم حقیقت! اس کی ہیروئن ایک مصمم ارادے کی مالک ہے۔ تب ہی تو اس نے وعدے کا مرتبہ اور اس کی عظمت کا پاس و لحاظ رکھا ہے ...... اس افسانے کی بابت اتنا ضرور کہوں گی کہ پڑھنے کے بعد قاری کا دل و دماغ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا ......!

آپ بھی پڑھ لیں ...... اور کسی بھی شمارے میں جگہ دے دیں کوئی جلدی نہیں ہے۔

نواز آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ لکھوا رہے ہیں کہ کچھ دنوں کے لیے آپ مدراس تشریف لے آئیں ـــ !

حبیب بھائی اور ثقلین بھائی سے ملاقات ہو تو ہمارا سلام سُنا دیں۔ عنقریب میں ان کے خطوط کا جواب تحریر کروں گی ..... !

آپ کی رائے اور جواب کی منتظر !

آپ کی بہن

صبا مصطفیٰ

وعدے کی عظمت

کئی دنوں سے مسلسل شدّت کی گرمی پڑھ رہی تھی۔ دھوپ کی تمازت اس قدر دل و دماغ کو بے قابو کر رہی تھی کہ اللہ کی پناہ....!

ان شدید گرمیوں میں میرے بڑے بھائی جان انیسؔ احمد کی شادی بڑے چچا کی اکلوتی بیٹی نسرینؔ کے ساتھ طے پائی تھی.......
نسرینؔ باجی اُن دنوں دہلی میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ اُن کے والدین لاکھوں کی جائداد اُن کے نام چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔

جب اُن کے والدین حیات تھے تبھی ابّا نے انیسؔ بھائی جان کے لیے نسرینؔ باجی کو بڑے چچا سے مانگ لیا تھا۔ یہ بات نسرین باجی کو بھی معلوم تھی۔ لہذا جب نسرینؔ باجی نے ڈاکٹری کا آخری سال کا امتحان دیا تو ابّا نے اُن سے شادی کی بات کی اور بتایا کہ شادی کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں صرف باجی کے آنے کی دیر ہے۔ باجی نے وقت پر آنے کا وعدہ کیا اور جب شادی کی تاریخ قریب آگئی تو ہم سب اُن کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے....!

شادی سے ایک دن پہلے ہی گھر میں خاص رشتہ داروں اور مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ ہر طرف گھر کے اندر اور باہر بچّے اور نوجوان

لڑکے اور لڑکیاں رنگین اور زرق برق لباس میں ملبوس اِدھر سے اُدھر خوشیوں میں گھوم پھر رہے تھے۔

ایک طرف مراثنیں خوب اچھل کود کر ناچ گا رہی تھیں سارا گھر اور آنگن رنگین اور چمک دار کاغذی پھولوں سے بنے ہوئے اور برقی قمقموں سے دلہن کی طرح سجے جگمگا رہے تھے۔ غرض کے سارا ماحول شادی کے ہنگاموں سے دل کش اور حسین لگ رہا تھا۔

مگر میری حالت اس وقت کچھ عجیب سی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا میرے افکار و تردّد میں اسی رفتار سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا...... نسرین باجی کو کل تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مگر وہ کل بھی نہیں آئیں اور آج بھی نہیں آئیں۔ ہم سب ایرپورٹ سے ناامید ہو کر دوبارہ واپس ہو چکے تھے۔ مگر پھر بھی ایک امید تھی کہ شام کی فلائیٹ سے وہ ضرور آئیں گی۔ لہٰذا ہم سب برابر ایرپورٹ جانے کی تیاری کرنے لگے۔

کل سے ابّا بھی بہت پریشان تھے۔ انھوں نے دہلی میں نسرین باجی کے ہوسٹل کو بھی کئی بار فون کیا۔ وہاں سے جواب ملا کہ باجی وہاں سے نکل چکی ہیں..... یہ جاننے کے بعد ابّا کی پریشانی اور بڑھ گئی کہ ابھی تک باجی یہاں پہنچی کیوں نہیں۔ وہ اپنی پریشانی کو چھپانے کی خاطر ہال میں جگہ جگہ کرسیاں بچھوانے لگے۔ مگر بار بار اپنی کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی کو بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ اور پھر کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ ان کی یہ بے تابی مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ میں انھیں سمجھانا چاہتی تھی کہ

وہ فکر نہ کریں باجی شام والی فلائیٹ سے ضرور آجائیں گی۔ یہ سوچ کر میں اُن کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ ایک پوسٹ مین ادھر آیا اور ابّا کو ایک خط دے گیا۔ ابّا نے خط کھولا اور عجلت میں پڑھنا شروع کیا۔ وہاں موجود سبھی رشتے دار خط کی طرف تجسس آمیز نظروں سے دیکھنے لگے۔

خط پڑھتے پڑھتے ابّا کی حالت غیر ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر سبھی لوگ پریشان ہوئے۔ ..... مراثنیں جو کچھ دیر پہلے ناچتی ہوئی سہاگ کے گیت الاپ رہی تھیں، اب اُن کے ڈھولک سے برہا کے تال نکلنے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شادی کی خوشیوں کے ہنگاموں پر خاموشی مسلّط ہو گئی۔ سب کے چہروں پر اداسی کی لہریں چھا گئیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو حیرت انگیز نگاہوں سے تکنے لگا۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر ماجرا کیا ہے...؟

میں بھی یہ دیکھ کر گھبرا گئی...... خط پڑھتے پڑھتے ابّا کے چہرے کا بدلتا ہوا رنگ یہ بتا رہا تھا کہ خط میں ضرور کوئی ایسے پیچیدہ معاملہ کا ذکر ہے، جس کی وجہ سے ابّا کی حالت غیر ہونے لگی ہے۔ اور پھر اچانک انکا جسم وجود لڑکھڑانے لگا۔ خط ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ابّا بھی چکرا کر زمین پر گرنے ہی والے تھے کہ اتنے میں لوگوں نے اُن کو بڑھ کر تھام لیا.....!

میری نظر خط کا تعاقب کرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اُسے اٹھا لیا۔ اور بے قراری کے عالم میں خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ خط نسرین باجی کا ہے۔ میں بے چینی سے خط پڑھنے لگی:

"معزّز چچا صاحب!

السلام علیکم !

یکے بعد دیگرے آپ کے کئی خطوط مجھے موصول ہو چکے ہیں مگر میں نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔ اس لیے کہ میں جواب لکھنا نہیں چاہتی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ آخر جواب میں کیا لکھوں ! حالاں کہ لکھنے کے لیے میرے پاس بہت طویل، مناسب اور آپ کے شایان شان موضوع تھا۔ مگر میں وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ وقت اب آگیا ہے۔۔۔۔!

بہرحال ۔۔۔۔۔۔! جب آپ کو میرا جواب نہیں ملا آپ نے فون کیا اور بتایا کہ شادی کی ساری تیاریاں ہو چکی ہیں۔ میں فوراً پہنچ جاؤں میں نے جواب دیا ٹھیک ہے، میں وقت پر پہنچ جاؤں گی ! اور دیکھیے۔۔ ۔۔۔۔! میں نہ سہی مگر میرا خط تو وقت پر پہنچ گیا ہے۔

خیر۔۔۔۔۔! آئیے اب مناسب موضوع پر گفتگو کرتے ہیں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔۔۔۔۔! آپ نے تقریباً اپنے ہر خط میں لکھا ہے کہ مجھے اپنے ابّا سے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کرنا ہے۔۔۔۔۔۔ یعنے آپ کے بیٹے سے مجھے ہر حال میں شادی کرنی ہے۔ خواہ جائز ہو یا ناجائز۔۔۔!

چچا صاحب! میں نے اپنے ابّا سے وعدہ ضرور کیا تھا۔ مگر اس وقت کے حالات الگ تھے۔ ماحول الگ تھا، بات الگ تھی۔ اس وقت ابّا پر حقیقت آشکار نہ تھی۔ وہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ آپ کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے تھے اور انہوں نے مجھ سے اس لیے وعدہ لے لیا تھا کہ آپ نے مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ وہ ایسی غلطی کبھی نہ کرتے۔۔۔۔۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ آپ کا یہ اصرار ان کی اکلوتی بیٹی کی زندگی کو تباہ و برباد

کر دے گا۔.... ! مگر خدا جو کرتا ہے وہ بہتر ہی کرتا ہے۔ اس نے مجھے جیتے جی جہنم کی آگ میں جلنے سے بچا لیا۔..... ! اس کے کچھ عرصہ بعد مجھے اپنی امّی سے بھی ایک اور وعدہ کرنا پڑا۔ ایک ایسا وعدہ جو ہر حال میں ابّا سے کئے ہوئے وعدے پر بھاری ہے...... !

امّی سے جو وعدہ میں نے کیا تھا اس وعدے کی عظمت کے بارے میں آپ کو کیا معلوم..... ! اس لیے میں اس وعدہ کی عظمت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہی ابّا سے کیا ہوا وعدہ وفا نہیں کر رہی ہوں...... یعنی آپ کے صاحب زادے سے میری شادی ناممکن..... !

میری اس نامنظوری میں بہت افسوس ناک اور دردناک حادثہ پنہاں ہے۔ اور اس حادثہ کے ذمّہ دار آپ ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے سوئے ہوئے ضمیر کو اپنی رنجیدہ خاطر اور تلخ و ٹھوس تحریروں کے ہتھوڑے مار مار کر جگاؤں تاکہ آپ کم از کم اپنے آپ پر ملامت تو کر سکیں۔

تو سنیے..... ! جب امّی کو اس بات کا علم ہوا کہ میں نے ابّا سے وعدہ کیا ہے کہ میں آپ کے بیٹے کے ساتھ شادی کروں گی تو وہ بہت پریشان ہوئیں۔ انھوں نے کھانا پینا سب کچھ چھوڑ دیا۔ اور بہت دکھی رہنے لگیں۔ خاموشی اُن پر بُری طرح حاوی ہو گئی۔ دن بدن اُن کی حالت گرنے لگی۔ اور پھر ایک دن وہ بسترِ مرگ پر دراز ہو گئیں۔ جانکنی کے وقت انھوں نے مجھ سے ایک ایسے جان لیوا حادثہ کا ذکر کیا کہ میرے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی اور میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔...

اسی وقت امّی نے مجھ سے ایک وعدہ لیا اور ایک خط ابّا کے نام دیا۔ پھر

اُن کی روح عالمِ ارواح میں پرواز کر گئی ......!

اَمّی کا خط ابّا کو میں دینا نہیں چاہتی تھی۔ کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ اس خط میں کیا لکھا ہے۔ مگر پھر بھی میں نے دے دیا۔ کیونکہ امّی نے کہا تھا۔ لہٰذا ابّا نے جب وہ خط پڑھا تو سخت صدمے سے دوچار ہوئے۔ یہاں تک کہ ان کی موت کا سبب بھی وہی خط بنا۔

ابّا کی موت کے بعد میں بالکل تنہا رہ گئی۔ ابّا کی لاکھوں کی جائداد مکانات، روپے، پیسے سب کچھ میرے نام منتقل ہو گئے۔ مگر مجھے دولت کی نہیں اَمّی سے کئے ہوئے وعدے کو نبھانے کی فکر تھی۔ ...... ابّا کی موت سے بھی یہ بات خوب اچھی طرح واضح ہو گئی تھی کہ ان کی بھی اب یہی مرضی تھی۔ کہ میں اَمّی سے کئے ہوئے وعدے کو وفا کروں! لہٰذا میں اسی وعدے کو نبھانے جا رہی ہوں ......!

حالاں کہ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنے سے میرے والدین کی عزّت میں یقیناً فرق پڑے گا اور میں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں گی۔ مگر اب مجھے کسی کا بھی کوئی خوف کوئی ڈر نہیں ہے۔ اس لیے کہ اَمّی نے مجھے اس بات کی اجازت دے دی تھی۔ اگر میں اس پر عمل نہ کروں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا ..... میرا احساس مجھے مارے گا! اور میری سوچ مجھے تڑپائے گی۔ کیوں کہ گنہ گار کو سزا تو ملنی ہی چاہیے۔ آپ میری نظر میں گنہ گار ہیں اور میں آپ کو سزا ضرور دوں گی۔ اس لیے کہ آپ نے میری زندگی کو گھائل کر دیا۔ آپ نے مجھے ایک ایسا ناسور دیا جس کا مداوا کہیں نہیں ہے۔ میں درد سے کراہ رہی ہوں

تڑپ رہی ہوں ۔ مگر نہ تو مجھے موت ہی آتی ہے اور نہ ہی زندگی زندہ رہنے پر اُکساتی ہے ۔ آپ نے میرے ساتھ ایسا ظلم کیوں کیا ۔ میری زندگی کے ساتھ ایسا گھناؤنا مذاق کیوں کیا ؟ کیا آپ کے پاس میرے ان سوالات کا ایک بھی جواب ہے ۔ ؟ ...... نہیں ! بالکل نہیں ! میں جانتی ہوں کہ آپ ان میں سے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دے سکتے ...... !

خیر ..... ! اب تک جو باتیں میں پہیلیوں میں بجھاتی آ رہی تھی اب میں کھل کر صاف صاف لفظوں میں بیان کرتی ہوں ...... !

میرے اَمّی سے جو میں نے وعدہ کیا تھا اس وعدے کی عظمت یہ ہے کہ میں آپ کے چہرے پر جو عزّت اور شرافت کا پڑا ہوا نقاب ہے، اُسے نوچ کر آپ کا اصلی روپ ساری دنیا کے سامنے لاؤں !

آج سے تقریباً بائیس ۲۲ سال پہلے آدھی رات کے وقت جب میرے ابّا شکار پر گئے ہوئے تھے آپ نے نشہ کے عالم میں میری اُمّی کی عزّت پر وار کیا ...... ! وہ کالی رات ..... ! ہے

برسات کی گھنگھور رات
یخ بستہ ہواؤں کی رات

اس رات کی تفصیل آپ سے بہتر اور کون جان جا سکتا ہے ؟

مجھے یہ لکھتے ہوئے روحانی اذّیت ہو رہی ہے کہ آپ جیسے رذیل انسان کی میں اولاد ہوں ! ایک شیطان نما انسان کی اولاد ! مجھے آپ سے نفرت ہے سخت ترین نفرت ! آپ جیسے پاپی اور وحشی درندے کی میں اولاد ہوں .... ! خُدایا ..... کاش یہ سچ نہ ہوتا .... ! یا پھر یہ حقیقت مجھ پر عیاں ہونے سے

پہلے ہی مر گئی ہوتی ....! ..... مگر! نہیں ! خدا کو یہ گوارا نہ تھا .....
اگر ایسا ہوتا تو پھر آپ کے اصلی چہرے کی نقاب کشائی کیسے ہوتی !!

آپ نے سچائی سے دُور بھاگنے کی کوشش کی۔ اسی لیے تو آپ نے امّی جان سے کہا کہ اگر انہوں نے ابّا سے آپ کا ذکر کیا تو آپ ابّا کو جان سے مار ڈالیں گے۔ امّی یہ سُن کر اندر ہی اندر ایک گھائل پرندے کی مانند تڑپتی رہیں، کراہتی رہیں......!

کس طرح انہوں نے مجھے نو ماہ اپنے پیٹ میں رکھا ہوگا! کس طرح وہ مجھے دنیا میں لائی ہوں گی! کس طرح میری پرورش کی ہوں گی؛ ..... کس طرح وہ ہر روز مر مر کر جیتی رہی ہوں گی! کس طرح انہوں نے اپنے آپ کو گناہ کے پردے میں چھپا کر موت کی راہ دیکھی ہوگی! یہ سب کچھ آپ جیسے کم ظرف انسان کیا جانے!

یہ خدا کا اصول ہے کہ وہ گنہ گار کو مزید گناہ کرنے کی چھوٹ دے دیتا ہے۔ اور آپ نے یہ خوب اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ گناہگار ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ اور پھر تیسرا گناہ ...... غرض کہ یہ سلسلہ اس کی موت تک قائم رہتا ہے۔

آپ نے صرف جائداد حاصل کرنے کی خاطر اپنے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح پڑھوانے کی تیاریاں شروع کر دیں ! ایک بھائی کے ساتھ ایک بہن کی شادی ..... !!!؟

دولت کے لالچ نے آپ کو کتنا گرا دیا ہے ! لعنت ہے آپ پر، اور آپ کی جھوٹی شان و شوکت پر !

عظیم میرا کلاس میٹ ہے۔ ہم نے آج ہی شادی کرلی ہے۔
کل ہم امریکہ کے لیے پرواز کررہے ہیں۔ جب یہ خط آپ کو ملے گا ہم امریکہ پہنچ چکے ہوں گے..... ! سچّائی کی جیت بہرحال ہوتی ہے..... دیر سے ہی سہی !
اور باطل برسرِعام رسوا و خوار ہوتا ہے۔

میری امّی سے کئے ہوئے وعدے کی عظمت کی قیمت اور اس کا اثر آپ نے دیکھ لیا! اب آپ اپنے رشتہ داروں، اور مہمانوں کے سامنے اپنی جھوٹی شان اور کھوکھلی عزّت کو نیلام ہوتا دیکھیے..... !

یقیناً آج میری امّی کی رُوح کو بھرپُور سکون اور چین میسّر ہوا ہوگا ——— !

●●

۲۲ر جنوری ۱۹۷۸ء
کلکتہ

مخزمی صدیقی صاحب!
السلام علیکم!

نئے سال کی خوشیاں مبارک ہوں۔ میری دُعا ہے کہ رسالہ "امن" اسی طرح دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

آپ کی خیریت عبدالعزیز مہندھرو بھائی کے خطوط سے برابر معلوم ہوتی رہتی ہے۔ تین دن قبل بھی ان کا خط آیا تھا۔ جس میں آپ کا خط بھی شامل تھا۔۔۔۔ یاد دہانی کے لیے دِل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

حسبِ فرمائش افسانے اور غزلیں مہندھرو بھائی کے پتہ پر ارسال کر چکی ہوں۔ وہ آپ تک پہنچا دیں گے۔۔۔۔ بھائی صاحب! آپ کی طرف سے میری بے حد ہمت و حوصلہ افزائیاں ہو رہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں! میری دانست میں ایسے کوئی موزوں الفاظ "شکریہ" ادا کرنے کے نہیں ہیں جنھیں میں آپ جیسے خلوص کار اور ادب نواز کے شایانِ شان ادا کروں! مفکروں نے جو چند الفاظ ایجاد کئے ہیں اور جو صدیوں سے بار بار دہرائے جا رہے ہیں، جیسے شکریہ، احسان مند ہوں، ممنون و مشکور ہوں، نوازش ہے، عنایت ہے وغیرہ وغیرہ! یہ سب اس قدر گھس پٹ گئے ہیں کہ بار بار انہیں لکھتے یا

کہتے ہوئے بوریت کا احساس ہوتا ہے ۔ مگر! مگر! پھر کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ مجبوری ہے ۔۔!

بہر کیف! یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے کہ میں رسالہ "امن" میں چھپ رہی ہوں ۔۔۔! آپ نے خط میں پوچھا ہے کہ ہندھرو بھائی میرے سگے بھائی ہیں کیا بھائی صاحب! اگر حقیقتاً عرض کروں تو یہی کہوں گی وہ میرے اپنے سگے سے بھی کہیں زیادہ ہیں ۔ اس لیے کہ آج ان کی ہی بدولت میری تخلیقات پاکستان کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں ۔ آپ کی مزید معلومات کے لیے میں یہ بھی عرض کر دینا یہاں ضروری سمجھتی ہوں کہ پاکستان میں میرے اپنے سگے یا دُور کے نہ تو کوئی رشتہ دار ہیں اور نہ ہی دوست و احباب! عزیز بھائی کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ یوں جاری ہوا کہ وہ اکثر ہندوستانی رسالوں اور اخباروں میں میرے افسانے اور غزلیات پڑھا کرتے تھے ۔ پھر انھوں نے مجھے خط لکھا ۔ مگر میں ان کے خط کا فوراً جواب نہ لکھ سکی ۔ چوں کہ اس طرح کے اور بھی کئی خطوط ہر دوسرے اور تیسرے ہفتہ موصول ہوتے رہتے ہیں، میری یہی کوشش رہتی ہے کہ میں سب کو جواب تحریر کروں ۔ اور پھر فرداً فرداً جواب لکھنے میں وقت تو لگ ہی جاتا ہے ۔ ہندھرو بھائی کے اس خط کے ایک ماہ بعد ان کا دوسرا خط مجھے ملا ۔ جب تک میں نے ان کے پہلے خط کا جواب لکھ دیا تھا ۔ مگر ان کے دوسرے خط کا جواب بھی مجھے فوراً ہی لکھنا پڑا ۔ اس لیے کہ انھوں نے مجھے بہن بنا کر بڑے ہی خلوص اور محبت سے یہ چند جملے درج کیے تھے:

"میری بہن! میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں ۔ میرا کوئی نہیں ہے ۔ آپ کو میں نے اپنی بہن بنا لیا ہے ۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ کو اس پاکیزہ رشتے سے کوئی اعتراض نہ ہو گا ۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے جینے کا سہارا مل جائے گا ۔

یہ خیال کر کے کہ میری ایک بہن ہندوستان میں ہے۔"

اُن کے اِن ہی چند جملوں سے میں بے حد متاثر ہوئی اور پھر اس طرح خط کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے لکھا کہ آپ اپنی تخلیقات مجھے ارسال کر دیا کریں۔ یہاں کے چند اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر میرے واقف کار ہیں، دوست ہیں۔ آپ کے افسانے اور غزلیں یہاں شائع ہوتی رہیں گی۔ بس اس ادبی ذریعہ سے ہم دونوں بہن بھائی کے پاک رشتے میں بندھ گئے.......
اب آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ مہندھرو بھائی میرے سگے بھائیوں سے بڑھ کر ہیں یا کم.......

بہرطور! آپ کو ہمیشہ یہی شکایت رہتی ہے کہ میں اپنی تخلیقات بہت تاخیر سے ارسال کرتی ہوں —— ! بھائی صاحب! کیا کروں! ایک عورت ہوں! اور عورت ہونے کے ناطے گھر کی ساری ذمہ داریوں کو بھی انجام دینا پڑتا ہے، اور دوسرے کاموں پر بھی اپنی پوری توجہ صرف کرنا پڑتی ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں کے علاوہ اگر ایک عورت کو فنونِ لطیفہ سے بھی دل چسپی ہو تو اس کے لیے مصیبت ہی مصیبت کھڑی ہو جاتی ہے۔ .... وقت کتنا مختصر ہوتا ہے دیکھتے ہی دیکھتے صبح سے شام ہو جاتی ہے اور عورتیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر پاتیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب وقت کا تقاضا ہی تو ہے جو پر لگا کر تیزی سے اڑ رہا ہے....... مگر پھر بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسی خواتین جو کچھ کرنے کی خواہش مند ہوتی ہیں جن میں ادبی ذوق ہوتا ہے۔ وہ اپنے فن کو اپنی غیر معمولی صلاحیت کے ذریعہ دنیا کے سامنے اجاگر کرنے میں اپنے وقت کا صحیح استعمال کیا کرتی ہیں اور بہت تھوڑے سے عرصہ میں وہ بہت کچھ کر لیا کرتی

ہیں۔ ایسی حالت میں یہ قیاس کرنا یقیناً ناممکن ہوجاتا ہے۔ ایسی نن کار عورتیں آرام کب کرتی ہیں۔۔!

اکثر میں سوچا کرتی ہوں کہ عورت کو خدا نے ماں بننے کا مبارک شرف عطا کیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ گھر کی ساری ذمہ داریاں بھی اس کے ہی سر پہ ڈال دی ہیں۔ مگر مردوں کو خدا نے بہت ہی تھوڑی سی ذمہ داری عطا کی ہے۔ کیا یہ اللہ میاں کی ناانصافی نہیں ہے۔!! اور پھر عورت آج ماضی کی وہ عورتیں تو رہیں نہیں جن کی تقدیریں گھر کی چہار دیواری کے اندر گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیا کرتی تھیں۔ آج کی عورتوں نے اپنے اوپر ہونے والے ظلموں کے خلاف آواز اٹھانے کا خوب اچھی طرح ہنر سیکھ لیا ہے۔ اس لیے آج کی عورتوں نے یہ بھی سمجھ لیا ہے اور خوب اچھی طرح جان لیا ہے کہ وہ بھی بھرپور صلاحیت کی مالک ہیں۔ اور مردوں سے بھی بڑھ چڑھ کر کام کر سکتی ہیں۔ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا لوہا منوا سکتی ہیں۔ اور آج یہ حقیقت دُنیا کے سامنے روزِ روشن کی طرح آشکار ہے کہ عورتیں مردوں سے زیادہ عقل مند، ہوشیار، دلیر و بہادر اور فرض شناس ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر عورتوں کو سماج کیوں آج بھی کمترین سمجھتا ہے۔ کمزور اور کم فہم تصّور کرتا ہے۔ آج عورتوں کے کارنامے دیکھنے کے بعد بھی سماج یہ کیوں چاہتا ہے کہ عورت آج بھی گھر کی چہار دیواری میں بند رہے۔ اور سارے خاندان کی خدمت کرے۔ شاید یہ مردوں کا احساسِ کمتری ہی ہے۔ انہیں یہ خدشہ لاحق ہوگیا ہے کہ عورتوں کو اگر برابر کا مقام دے دیا جائے تو وہ اُن سے آگے نکل جائیں گی۔ اور مردوں کے نام بدنام ہوجائیں گے۔!

اور یہ سو فی صدی حقیقت ہے کہ عورتیں آج ترقی کے ہر میدان میں مردوں سے آگے نکل چکی ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ مردوں کو گھروں کی زینت سمجھا جائے گا اور عورتیں دفتروں، کارخانوں، اسکولوں، کالجوں، ہسپتالوں، ہوائی جہازوں، پولیس، نیوی ایر فورس اور راکٹوں غرض کہ ہر میدان میں نظر آئیں گی۔

بھائی صاحب! شاید آپ میرے اس خیال سے متفق نہ ہوں اس لیے کہ آپ بھی ایک مرد ہیں۔ مگر سچّائی تو سچّائی ہے۔ اس کا اعتراف تو بہر حال ضروری ہے

خیر ـــ! مجھے آپ کو یہ بتانا تھا کہ عورتیں کتنی مصروف ہو گئی ہیں۔ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میری تخلیقات دیر سے کیوں پہنچتی ہیں۔ میری مصروفیات کا بھی یہ عالم ہے کہ مجھے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالنے کی بھی فرصت نہیں ملتی ـــ اب دیکھئے ناچار دن قبل ہی چار دنوں کے بعد مشاعروں سے واپس آئی ہوں۔ چار دن کی غیر حاضری سے میرے گھر میں قیامت سی آگئی ہے۔ آپ کا خط پوسٹ کرنے کے بعد ہی جو کام رہ گئے ہیں انھیں پورا کروں گی ـــ!

ارسال کردہ افسانوں میں آپ "ے ا سال پہلے" افسانہ پہلے شائع کر دیں۔ حالاں کہ یہ مختصر ہے مگر یہ افسانہ کم حقیقت زیادہ ہے۔ میں نے جھندھرو بھائی سے کہہ دیا ہے کہ اس افسانہ کو پہلے شائع کروا دیں۔ اس لیے کہ اس افسانے کا ہیرو آج کل ہمارے یہاں مہمان ہے۔ اس کا قیام یہاں چند ماہ رہے گا۔ اس درمیان اگر "ے ا سال پہلے" اُمن، میں شائع ہو گیا تو مجھے خوشی ہوگی ـــ!

آپ کے جواب کا شدّت سے انتظار رہے گا۔!

خیر اندیش

صبا صدف!

۱۷ سال بعد

جوں ہی دروازے کی گھنٹی بجی، کمل اپنے بستر سے اٹھ کر دروازے پر پہنچا۔ سامنے ایک اجنبی نوجوان کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کمل کو دیکھتے ہی وہ مسرّت سے بھرپور آواز میں بولا۔

"میں انڈیمان سے آیا ہوں بھائی صاحب!"

"آئیے اندر آجائیے ....." کمل نے اُسے اندر آنے کے لیے کہا۔

ڈرائینگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس اجنبی نوجوان نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا تو کمل نے پوچھا۔ "کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"مجھے ادیب احمد کہتے ہیں۔ اور میں بشیر احمد صاحب کا لڑکا ہوں، شاید آپ نے اُن کا نام سُنا ہو۔"

بشیر احمد سنتے ہی کمل کچھ چونک گیا۔ "وہی بشیر احمد صاحب نا جن کا دہلی میں کچھ عرصے پہلے بہت بڑا کاروبار تھا —"

"وہی .....، لیکن جب سے ڈیڈی انڈیمان گئے سارا کاروبار ختم ہوگیا۔"

کمل کچھ لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہوگیا، اسے جیسے ماضی کی کوئی بات یاد آگئی ہو۔ پھر وہ اپنے اوپر قابو پا کر بول اٹھا ..... "کیوں؟"

"آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ ڈیڈی یہاں فلم ڈسٹری بیوٹر تھے۔ ایک بہت بڑی فلم کی ناکامی نے انہیں دیوالیہ بنا دیا تھا۔ پھر یہاں جو کچھ تھا وہ

فروخت کر کے انڈیمان چلے گئے تو وہاں بھی کچھ زیادہ اچھی حالت نہ بنی ....،،

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کمل نے بڑے پیار سے پوچھا۔" اچھا اب آپ کیا کر رہے ہیں ؟"

"میں یہاں ایک انٹرویو کے سلسلے میں آیا تھا۔ کل میرا میڈیکل ایگزامینیشن ہے اور میرے پاس بہت کم روپے رہ گئے ہیں۔ گھر پہ تار بھی دے دیا ہے مگر ابھی تک روپیہ نہیں آیا۔ کل مجھے سو روپے کی سخت ضرورت ہے۔" اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔

" تو آپ گھبرا کیوں رہے ہیں ؟ اور اتنی چھوٹی سی رقم کے لیے اتنے پریشان کیوں ہیں ؟" اتنا کہہ کر کمل نے اس کی طرف سو روپے کا نوٹ بڑھا دیا۔

ادیب نوٹ کو احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔" بہت بہت شکریہ کمل صاحب! آپ نے سچ مچ میری بڑی بھاری پریشانی دور کر دی، آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں .....،،

لیکن شاید کمل گونگا اور بہرا ہو چکا تھا۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کہ ادیب احمد کب اس کا شکریہ ادا کر کے باہر چلا گیا ہے، وہ تو حال سے بہت دور کہیں ماضی کے اس دردناک بھنور میں کھو گیا تھا۔ جو برسوں پہلے اس کی زندگی کے دھارے کو بدل گیا تھا۔

آج سے کوئی ۷ اسال پہلے جب خود کمل کو دہلی کی ایک بہت بڑی انگلش کمپنی میں ایک اونچی پوسٹ کے انٹرویو کے سلسلے میں آنا پڑا تھا تو وہ بڑی مصیبت کے ساتھ دہلی پہنچ پایا تھا۔

آج سے ۷ اسال پہلے کا وہ دن آج کے دن کی طرح اُس کی آنکھوں کے سامنے

تھا۔ فرق صرف اتنا تھا، ۱۷ سال پہلے کے منظر میں ادیب احمد کی جگہ وہ خود کھڑا تھا اور اس کی جگہ دہلی کے مشہور لکھ پتی سیٹھ بشیر احمد تھے۔

۱۷ برس پہلے وہ بھی اسی طرح ایک انٹرویو دینے کے لیے دہلی آیا تھا اور اس کے پاس واپسی کا کرایہ نہ تھا..... ۱۷ برس پہلے اس نے بھی بشیر احمد صاحب کے سامنے ہاتھ پھیلائے تھے...... لیکن وہ ہاتھ جھٹک دئیے گئے تھے اور بشیر احمد صاحب نے اس کے ڈرائینگ روم سے نکلتے ہی اپنی بیوی سے کہا تھا۔

"دیکھا بیگم..... بھیک مانگنے والے بھی کیسے کیسے بھیس بنا کر آتے ہیں..."

••

انگاروں کا شہر

"اچھا ہوا تم مل گئیں رما ــــ گاؤں چھوڑے ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ چلو گھر چل کر باتیں کرتے ہیں۔"

دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ریحانہ کے ساتھ چل پڑی۔

"ایک دن یہیں ٹھہر جاؤ نا۔" ریحانہ بولی۔

"نہیں ــــ ریحانہ! یہ انگاروں کا شہر مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا یہاں قدم قدم پر دھوکا ہے، لوگ روپے کے لئے رشتے ناتے کچّے دھاگوں کی طرح توڑ دیتے ہیں۔ یاد کرو ہمارا گاؤں کتنا اچھا ہے۔ میں گاؤں کے اسکول میں اُستانی ہوں، سب لوگ میری عزّت کرتے ہیں ــ"

"وہ تو ٹھیک ہے رما۔ لیکن شہر میں سب ایک سے نہیں ہوتے! مجھے دیکھو ــــ میں یہاں کتنی سُکھی ہوں، پیار کرنے والا ایک شوہر کے علاوہ ایک اچھا گھر ہے۔ میں تو کہتی ہوں تم بھی یہیں رہ جاؤ۔" ریحانہ نے ضد کی۔

"تمھیں تو معلوم ہے کہ میری موسی نے مجھے یہاں بلا کر دوسروں کے ہاتھ بیچنا چاہا، لیکن میں ہی بھاگ نکلی ــ" یہ کہتے کہتے رما کی آنکھیں بھر آئیں۔

"ارے پگلی روتی کیوں ہو؟ بُرا وقت تو ٹل گیا نا ــــ وہ دیکھو میرا گھر بھی آ گیا۔"

پھر جیسے ہی وہ دونوں اندر داخل ہوئیں ایک گرج دار آواز نے ریحانہ

کا استقبال کیا۔

"کہاں مرگئی تھی ؟ —— دو غیر ملکی آئے تھے، شیطانوں نے پرانی لڑکیوں میں سے کسی کو بھی پسند نہیں کیا —— بول یہ نقصان کون پورا کرے گا ؟"

ریحانہ کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ پڑا اور وہ پیر پٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔ اور رما کبھی ریحانہ اور کبھی بند دروازے کو دیکھتی رہ گئی۔!! ••

۴۔اپریل ۱۹۷۸ء

مدراس

میرے محترم احساس بھائی صاحب!

سلام مسنون!

خدا کرے آپ بالکل اچھے ہوں ـــــ ایک ہفتہ قبل آپ کا مراسلہ ملا۔ جس سے پتہ چلا کہ آپ کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ اس کے علاوہ اور کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ آپ کسی کی بات سنتے ہی نہیں۔ اور میری بات کیوں سننے لگے۔ میں آپ کی سگی بہن تو ہوں نہیں۔ منہ بولی بہن جو ہوں۔ ورنہ آپ کب کے میری بات مان چکے ہوتے۔ میری رائے پر عمل کر چکے ہوتے ـــــ میں نے آپ کو کوئی گناہ یا جرم کرنے کی رائے تو دی نہیں۔ بس یہی نا کہ "میرے بھائی اپنی صحت کا خیال رکھیں۔ کھانے پینے کے وقت کا لحاظ رکھا کریں۔ ادبی خدمت کرنے کا جو سچا اور بے لوث جذبہ اور لگن آپ کے دل میں ہے اُسے ضرور برقرار رکھئے مگر آرام کے لیے بھی تو خدا نے کوئی وقت مقرر کیا ہے۔ اس وقت کا فائدہ اٹھائیں۔ مشاعروں میں شرکت کرنے سے آپ کو کون روکتا ہے۔ مگر ہاں! مشاعروں کے لیے دُور دراز کے شہروں کا سفر نہ کریں ۔ اس سے آپ کی صحت بے حد متاثر ہوتی ہے اور پھر آپ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ میں اس حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف ہوں۔ کیونکہ

میں نے کئی مشاعرے آپ کے ساتھ پڑھے ہیں۔"!

میرے بھائی! اب تو سنبھل جائیے۔ کچھ تو سوچئے۔ آپ کے گھر پر بھی تو کوئی نہیں ہے جو آپ کا خیال رکھے۔!

آپ کو یاد ہوگا کلکتہ میں قیام کے دوران میں نے کئی بار آپ سے پوچھا تھا کہ آپ تنہائی کی زندگی کو کیوں ترجیح دیتے ہیں۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ بھابی کیوں نہیں لے آتے۔ گھر میں بھابی ہوں گی تو آپ کا پورا پورا خیال رکھیں گی اور آپ کو بھی وقت کی پابندی کا پورا پورا احساس رہے گا۔ ——— مگر آپ نے مجھے کبھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ آج پھر میں وہی سوال آپ سے کر رہی ہوں۔ مگر اس بات کا خیال ضرور رکھیئے کہ میں پھر سے آپ کا وہی بار بار دہرایا ہوا کمزور بہانہ سُننے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ ——— چوں کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کہیں گے۔ یہی ناکہ "میری بہن! میں ایک قلم کار ہوں، حساس دل ہوں، بہت جذباتی ہوں۔ جب میں اپنے ملک کے چاروں طرف ہزاروں، لاکھوں لوگوں کو دیکھتا ہوں جو بے روزگاری کے عالم میں اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں تو بہت دُکھی ہو جاتا ہوں ——— فٹ پاتھوں میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے بن ماں باپ کے چھوٹے چھوٹے معصوم اور بے سہارا بھوک سے تڑپتے ہوئے بچّوں کو دیکھتا ہوں تو اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔ یہ بچّے ہندوستان کا مستقبل ہیں۔ آج ان کی یہ گرتی ہوئی حالت کل کیا انھیں اس قابل بنا سکے گی کہ یہ اپنے ملک کی بھاری ذمہ داریوں کو اپنے لاغر کندھوں پہ اٹھا سکیں۔ میں اگر شادی کرلوں گا تو میرا پیغام جو میرے ملک

اور عوام کے لیے ہے وہ ادھورا ہی رہ جائے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شادی کے بعد انسان کو گھریلو الجھنیں پریشان کر دیتی ہیں۔ اور میں یہ غلطی کبھی کرنا نہیں چاہتا ۔"!

خوب بہت خوب میرے بھائی! آپ اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔ مگر دنیا میں اور بھی تو ایسے انسان ہیں جو آپ ہی کی طرح قلمکار اور فن کار ہیں، حساس ہیں، جو اپنے ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کرنے کے بھرپور جذبات اور خواہشات رکھتے ہیں اور اپنے اپنے فن کے سہارے وہ اپنے ملک اور قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ مگر وہ سب آپ کی طرح تنہائیوں کی زندگی نہیں جی رہے ہیں۔ اُن کے اپنے گھر ہیں، بیویاں ہیں، بچے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر بھائی صاحب! ہم انسان ہیں۔ خدا نے انسان کو دنیا میں اس لیے پیدا کیا کہ وہ دین بھی دیکھیں اور دنیا بھی۔! دین سے مراد! مذہب یعنی خدا کی عبادت کرنا، قرآن شریف جو خدا کی کتاب ہے جس میں دنیا میں رہنے کے سارے قانون اور قاعدے درج ہیں۔ ان پر عمل کرنا، احادیث پر چلنا اور برائی سے بچنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے کاروبار پر بھی پوری نظر رکھنا، اپنے خاندان کے بارے میں سوچنا ان کا خیال رکھنا، بُرے اوقات میں ان کی مدد کرنا، اپنا گھر بسانا، بیوی بچوں کی دیکھ بھال کرنا، اُن کی ضرورت کی ہر ایک چیز کو مہیا کرنے کے لیے اور انھیں خوش رکھنے کے لیے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنا اور پھر انسانیت کی خدمت تو ساتھ ساتھ ہی چلتی ہے۔ ان تمام مصروفیتوں میں کتنا لطف اور کتنا سکون ملتا ہے۔ خدا بھی خوش ہوتا ہے اور رسولؐ

بھی ! مگر آپ کو کون سمجھائے۔ ! سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی آپ انجان بنے ہوئے ہیں۔ !

خیر۔ ! اس دفعہ میں آپ کے جواب میں آپ کا آخری اور صحیح فیصلہ جاننا چاہتی ہوں۔ اگر پھر آپ نے مجھے مایوس کیا تو یہ سمجھ لیں کہ یہ میرا آخری خط آپ کے نام ہوگا۔

لیجئے۔ ! "کلائمکس" حاضر ہے۔ کسی قریبی شمارے میں شائع کر دیں۔ "وعدے کی عظمت" کے بارے میں آپ نے لکھا کہ ہر شمارے میں "تاثراتی کالم" میں قارئین کے تعریفی خطوط شائع ہو رہے ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔۔۔ پچھلے کئی شمارے وصول نہیں ہوئے ورنہ میں خود پڑھتی اور میری زیادہ ہمت اور حوصلہ افزائی ہوتی۔

"کلائمکس" کے بارے میں کیا لکھوں۔ آپ پڑھ لیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ میرا ہر افسانہ حقیقت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اور میرے خیال میں افسانہ اسی وقت بنتا ہے جب حقیقت پرانی ہو جاتی ہے اور اسے کہانی کا نام دے دیا جاتا ہے۔

زیرِ نظر کہانی ایک ایسی لڑکی کی داستان ہے جو اپنے محبوب پر ہزار جان سے نثار ہے مگر اس کے محبوب کو اس کی گہری محبت کا کوئی علم نہیں ہے۔۔۔ ایک طرفہ محبت اگر روگ بن جائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ کو "کلائمکس" میں ہوگا۔

خدا کرے آپ کا جواب تشفی بخش آئے۔ خدا حافظ

آپ کی بہن

صبا سلطانہ

کلائمکس

نمبر ڈائیل کرنے کے بعد نازنین بے تابی سے دوسری طرف بجنے والی گھنٹی کو سننے لگی۔ اتنے میں گھنٹی کی آواز رکی اور کسی کی آواز ریسیور میں گونج اٹھی۔

"ہیلو — !"

"جی ..... جی! جی کمار صاحب ہیں؟" نازنین نے گھبراہٹ اور مسرت کے ملے جلے انداز میں پوچھا۔

"کمار صاحب! — کون کمار صاحب؟"

"کمار صاحب وہی جن کا اصلی نام شہزادہ پرویز ہے اور جو فلمی خزانے کے انمول ہیرا ہیں۔"

نازنین کمار کی آواز پہچان کر مسرت بھرے لہجہ میں بڑبڑائی۔ وہ کیوں نہ پہچانتی! کمار صاحب کی آواز تو اس کے روم روم میں رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ اس کا سب سے پیارا محبوب تھا۔ اس کے سپنوں کا شہزادہ تھا۔ اس کی اپنی کہانی کا سب سے خوب صورت عنوان تھا — کوئی بھی فلم وہ چھوڑ سکتی تھی۔ مگر کمار کی فلم خواہ نئی ہو یا پرانی ضرور دیکھتی تھی۔ اس کے لیے اسے کبھی کبھی گھر والوں سے بہانے بھی تراشنے پڑتے تھے۔ جھوٹی قسمیں بھی کھانی پڑتی تھیں۔ یہ سب گناہ کمار کی فلم دیکھنے کے لیے اس کے نزدیک جائز تھے۔ جب وہ اسکرین پر کمار کو دیکھ لیتی تو اس کو ایک حد تک سکون اور چین نصیب ہو جاتا تھا

برسوں سے وہ کمار کی مالا جپ رہی تھی۔ کمار سے اس کو اس قدر والہانہ محبت تھی کہ اس نے اس کی آواز کو بھی ٹیپ کر رکھا تھا، تاکہ تنہائی کا سہارا بنے اور اس کو سُن کر وہ اپنا دل بہلا لیا کرے۔ پھر بھلا وہ کس طرح اس کی آواز کو بھلا سکتی تھی۔ مگر اس طرف کے دوسرے جملے نے اس کی ساری مسرتوں کو غم میں بدل ڈالا۔ اس کے اُبھرے ہوئے جذبات کو مجروح کر دیا۔

"یہاں کوئی کمار نہیں رہتا۔"

یہ کہہ کر وہ جانی پہچانی آواز بند ہوگئی۔ نازنین کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں یک لخت بند ہوگئیں ہوں! اور وہ تڑپ اٹھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہوگیا۔ معلوم نہیں وہ کب تک ٹیلیفون کو اسی طرح دیکھتی اور سُنتی رہی، جیسے اب بھی وہ اپنے محبوب کی آواز سُن رہی ہو۔

اس دن کے بعد وہ بہت اداس اداس رہنے لگی۔ اس کا دل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ آنکھوں سے سیلاب رواں تھا اور بار بار اس کے معصوم لرزتے ہونٹوں سے یہ اشعار پھوٹ پڑتے تھے۔

اب بہاروں میں دل نہیں لگتا   لالہ زاروں میں دل نہیں لگتا

یادِ محبوب جان لیتی ہے   ان نظاروں میں دل نہیں لگتا

بجھی بجھی سی رہنے کے باوجود بھی وہ تجسس کے اتھاہ ساگر میں غوطہ لگا رہی تھی کہ اچانک اُسے پتہ چلا کہ کمار فلاں پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی فلم میں کام کر رہا ہے اور اتفاق سے وہ پروڈیوسر نازنین کا پڑوسی نکلا۔ وہ خوشی کا دامن تھامے اس کے یہاں پہنچی اور اپنا مقصد ظاہر کیا۔ پروڈیوسر اس کی باتوں کو بہت غور سے سُن رہا تھا۔ گویا وہ نازنین کو ہر لحاظ سے اپنے فن کی کسوٹی پر پرکھ رہا ہو .... میانہ قد، گندمی رنگ، بڑی

بڑی خوب صورت آنکھیں جیسے کسی حسین جھیل میں دو خوب صورت کنول کھلے ہوں۔ ہونٹ گلاب کی دو لطیف اور نازک پنکھڑیاں، چوڑی پیشانی، کالی اور لمبی لمبی ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی زلفیں۔ اس پر حُسن کو چار چاند لگانے کے لئے نائیلکس کی سفید ساڑی، گویا وہ پیکرِ حُسن تھی۔۔۔۔ حُسن تو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ جن نظروں سے دیکھیں گے اس کی شخصیت اسی طور سے نمایاں ہوگی۔

اس وقت پروڈیوسر صاحب کو نازنین کا پیکر مجسمۂ حُسن لگ رہا تھا اور انھوں نے اپنے دل کے آئینہ میں نازنین کو اچھی طرح اتار لیا۔

غرض کہ دوسرے روز صبح گیارہ بجے پروڈیوسر صاحب نے نازنین کو اپنے آفس آنے کو کہا اور وعدہ کیا کہ وہ ضرور کمار صاحب سے اس کا تعارف کرائیں گے۔ نازنین جھوم اٹھی۔ گذشتہ دنوں وہ، جو برہا کے گیت گایا کرتی تھی اب اس کا دل ملہار گانے لگا۔ ؎

تیرے پاس آکے ٹھہر جانے کو جی چاہتا ہے — تیری آغوش میں بھر جانے کو جی چاہتا ہے
ذلتیں لاکھ ہوں رسوائی ہو، بدنامی ہو — جس طرف تو ہے ادھر جانے کو جی چاہتا ہے

آج تو وہ اور بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ساڑی میں ملبوس اس کا گندمی رنگ اور بھی نکھر آیا تھا۔ اس کا چہرہ شاداب گلاب کی قوس قزح کے رنگوں کی مانند کھل رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی کیوں کہ آج اس کی دیرینہ تمنّا پوری ہونے والی تھی۔ برسوں کی تپسّیا کا انجام اس کے سامنے آج آنے والا تھا اس کی پاک محبّت کا صلہ اس کو آج ملنے والا تھا۔

پروڈیوسر صاحب نے نازنین کو دیکھا۔ جو سراپا حُسن کی دیوی نظر آرہی

تھی، اُسے احتراماً اندر کے کمرے میں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"مس نازنین آپ اندر چل کر آرام سے بیٹھئے میں اتنی دیر میں کمار صاحب کو فون کر کے بلا لیتا ہوں۔ اس وقت تک تو انھیں یہاں پہونچ جانا چاہیے تھا۔"

نازنین کو روحانی مسرت ہوئی۔ وہ مسکرائی اور بل کھاتی ہوئی مسرت آمیز انداز میں کمرے میں داخل ہوئی ــــ سامنے دیوار پر آویزاں ایک بہت ہی بڑی خوبصورت تصویر پر اس کی نظر ٹھہر گئی ـــــ جو بہت ہی حسین اور دل موہ لینے والی تصویر تھی چاروں طرف گہرے نیلے رنگ کا سمندر غیض وغضب میں اپنی لہروں کو اچھال اچھال کر ساحل کی طرف ڈھکیل رہا تھا اور دُور بہت دُور۔! ایک ناؤ گرداب میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ اس کا نہ پتوار ہے اور نہ ہی مانجھی۔ ناؤ پر سوار ایک تنہا وجود ہے جس کی صورت سے خوف وہراس، یاس وحرماں کے آثار نمایاں ہیں۔ آرٹسٹ نے بڑی خوبی اور صلاحیت سے اس حقیقت کو تصویر میں پیش کیا تھا۔

نازنین اس پینٹنگ میں محو ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا دھیان اس وقت ہٹا جب دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز آئی ــــ اور ــــ پھر....... پھر ..... پھر..... اس کے سامنے ناؤ کا دہشت انگیز انجام تھا ـــــ کوری ساڑی اور کورے بدن میں ایک بدنما داغ لئے وہ تڑپ رہی تھی۔ دل کے ہزار ہا ٹکڑے ہو کر بکھر گئے اور ہر ٹکڑے سے ایک کراہتی ہوئی صدا بلند ہوئی تھی۔ جس میں ایک فریاد تھی۔ ایک دل کو دہلا دینے والی پکار۔ ایک بے ہنگم چیخ پنہاں تھی مگر وہاں اس کی پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔ چاروں طرف شیطانوں کا اڈا تھا۔ بھوکے ہوس کے درندوں کا پہرہ تھا۔ اس کی پاک روح ناپاکی کی غلاظت سے ملوث ہو چکی تھی۔ وہ بے دم سی بوجھل قدموں کے ساتھ اٹھی اور اس نے جوں ہی آفس سے باہر قدم نکالا، اس کی بے نور نظریں بے اختیار

سامنے کھڑی لمبی لمبی سفید کار پر گئیں۔ وہ تڑپ اٹھی گھائل ہرنی کی مانند! اس کا دل دہل گیا۔ کمار اس کار سے باہر نکل رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ حسبِ معمول سفید شرٹ اور سفید پینٹ میں ملبوس حُسن کا دیوتا نظر آرہا تھا۔ نازنین کی بے نُور اور بے کیف سی آنکھیں اسی جگہ ٹھہر گئیں۔ اس کے لڑکھڑاتے ہوئے قدم وہیں جم گئے۔

وہ یوں ہی دروازے کا سہارا لیے دیکھتی رہی۔ حسرت بھری نگاہوں سے تکتی رہی۔ جب تک وہ اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا۔ جب تک وہ اسے یوں ہی تکتی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس کے وجود کو اپنی تھکی تھکی نظروں میں جذب کر لینا چاہتی ہے۔

اس کی نظروں سے آبشار رواں تھے۔ فوراً ہی اس کا تخیل اس تصویر کی طرف کی طرف گیا۔ اسے اپنی بے کسی اور بے بسی کا احساس ہوگیا۔ دل و دماغ پر ایک زبردست دھچکا سا لگا۔ اس کا دماغ اس کے قابو میں نہ رہا اور وہ ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگتی گئی۔

اُسے لوگ پگلی نازو کے نام سے بلانے لگے وہ کبھی روتی اور کبھی بے اختیار ہوکر ہنستی۔ مگر اس کی زبان پر اب کسی کا نام نہیں آتا، نہ کمار کا اور نہ اس ظالم پروڈیوسر کا شاید اس کی زبان سلب ہوگئی تھی۔ اس وحشت ناک انجام نے اس کے ہونٹ سی دئے تھے — مگر وہ اپنے دل کے کراہتے ہوئے مجروح ٹکڑوں سے برابر یہ آواز سنتی رہتی تھی۔ ؎

مرا سکون، مِرا صبر لُوٹنے والے — خدا نے چاہا تو اک پل نہ چین پائیں گے
ہمارے جذبۂ الفت پہ ہے یقیں ہمکو — ہمارے پاس وہ اک روز کھنچ کے آئیں گے

●

۸ر جون ۱۹۷۸ء
مدراس

محترمہ زیب النساء صاحبہ
مدیرہ "آنچل" کراچی

خلوص بیکراں!

حالاں کہ میں آپ کو پہلی بار خط تحریر کر رہی ہوں۔ مگر آپ کے "آنچل" سے بہت قریب ہوں۔ جب جب بھی مجھے آپ کا حسین و جاذب نظر "آنچل" نصیب ہوتا ہے، میری نظروں کو بڑی راحت اور دل ودماغ کو بڑی تقویت پہنچتی ہے...... "آنچل" کو ہاتھ میں لے کر جب "سرگوشیاں" کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہوں تو آپ کے انداز تحریر سے بڑی حد تک لطف اندوز ہوتی ہوں۔ آپ کی تحریریں شائستگی اور تہذیب سے ملوث ہیں۔ آپ کی یہ ادبی خدمات آپ کے بلند اخلاق اور آپ کے پاکیزہ تخیلات کی غمازی کرتی ہیں۔ آپ کا یہ خلوصِ فراواں نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ آپ نے نئے قلم کاروں کو اپنے وسیع و عریض اور ممتاز آنچل کے دامن پر طبع آزمائی کے لیے دعوتِ تحریر دیتی ہیں۔ یہ آپ سے غائبانہ تعارف کا ایک خوب صورت انداز ہے اور آسان طریقہ ہے جس سے میں بہت متاثر ہوں۔

پہلی بار جب میرے بھائی عبدالعزیز مہندھرو کراچی نے ماہنامہ "آنچل" مجھے تحفتہً ارسال کیا تو شروع میں رسالہ کی طرف میں نے کوئی خاص توجہ نہ کی۔ مگر بعد میں جب رسالہ کو پڑھنا شروع کیا تو آنچل کی زیبائی، انفرادیت اور معیاری تحریروں سے دُور نہ رہ سکی۔ لہذا بہت ہی جلد میں نے آنچل کے سارے افسانوں کو پڑھ لیا۔ میری پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ میرے دل میں یہ خواہش اجاگر ہوئی کہ میں بھی "آنچل" کے صفحات پر اپنے ذہن کے گوشوں سے نکلے ہوئے چیدہ چیدہ خیالات کو سجا دوں۔ لہذا میں کوئی اچھے سے پلاٹ کی جستجو میں تھی کہ اس اثنا میں بھائی مہندھرو کا خط آیا کہ "آنچل" کے لیے کوئی اچھا سا افسانہ جلد سے جلد ارسال کریں۔

خط پڑھنے کے بعد میں سوچ میں پڑ گئی کہ آنچل کے معیار کا افسانہ فوراً تحریر کرنا مشکل نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ حالاں کہ ایک کردار میرے ذہن میں بہت دنوں سے پرورش پا رہا ہے ـــ کچھ عجیب سا، نایاب سا اور اچھوتا سا کردار ہے۔ اگر اس کردار کو افسانے کے ڈھانچے میں ڈھالا جائے تو اس کے لیے وقت درکار ہے۔ .... مگر عزیز بھائی کے خط کو بار بار پڑھنے کے بعد میرے اندر جیسے ایک طوفان سا برپا ہوا۔ ایسا لگا جیسے کوئی بہت بڑی جوالا مکھی میرے اندر سما گئی ہے اور اب وہ باہر نکلنے کی کوشش میں مجھے بے چین اور بے قرار کر رہی ہے ..... بس کیا تھا! جہاں جذبہ، شوق اور لگن ہو وہاں انسان ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے ـــ!

رات دن کی کوششوں کے بعد میں نے "بہت دیر کی" کی تخلیق کی ...... یہ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں مفکروں نے یہ تحقیق کی ہے کہ

انسانی زندگی سے متعلق اکیس[21] یا بائیس[22] پلاٹ ہی ہیں۔ ان محدود بنیادوں کو لے کر آج دنیا کے لامحدود انسانوں پر کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ مگر ہر تخلیق کار کی تخلیق کا رنگ بالکل ہی جداگانہ ہوتا ہے کبھی کبھی خیالات میں کھا بھی گئے تو اندازِ بیان کی ندرت اور شائستگی سے کہانی کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔

"بہت دیر کی" کے ہیرو کا کردار میرے خیال میں ایجاد کردہ ان پلاٹوں سے کچھ ہٹ کر اپنا الگ ایک مقام رکھتا ہے۔! آپ بھی دیکھ لیں۔ ہیروئین کا کردار بھی قابلِ توصیف ہے۔ مگر ایسے کردار اکثر نمودار ہوا کرتے ہیں۔ .... عشق و محبت کی داستانیں روزِ ازل سے اپنے اپنے انداز میں منظرِ عام پر ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں۔ جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، ہیر رانجھا وغیرہ وغیرہ مگر شہزاد کو کس نام سے پکارا جائے، اس لیے کہ شہزاد نے مجنوں، فرہاد اور رانجھا کی داستانوں کو بھی اپنی محبتِ بیکراں سے بالکل ہی پھیکا کر دیا ہے۔ آپ ہی بتائیں کہ میں شہزاد کو محبت کی پاک اور معصوم دنیا میں کس نام سے پکاروں !!

افسانہ ملتے ہی جواب سے نوازیں۔ ممنون ہوں گی۔ امید ہے آپ مع متعلقین بعافیت ہوں گی۔ !

ایک خلوص کار

صبا مصطفیٰ

بہت دیر کی مہرباں

ممتاز کوئی دس سال بعد دارجیلنگ لوٹی تھی۔ اسٹیشن پر ٹرین سے اتری تو اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ کوئی انجانا سا خوف ذہن پر چھائے جا رہا تھا۔ آبائی وطن ہونے کے باوجود وہ خود کو کسی نامانوس جگہ پر محسوس کر رہی تھی۔ گرد و پیش کی ہر شئے سے اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا اور اس کی وجہ بھی تھی۔ دنیا دس سالوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی ہر آن بدلتی دنیا نے اس ریلوے اسٹیشن کا بھی حلیہ بدل ڈالا تھا۔

یہ وجہ اجنبیت کا احساس دلانے کے لیے بہرحال ضروری تھی لیکن انجانے خوف کا بظاہر کوئی جواز نہ تھا اور حقیقت میں اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ یہ احساسِ جرم تھا جو اُسے کسی خدشے کا یقین دلا رہا تھا۔

اسی احساسِ جرم کے باعث وہ آج دس سال بعد اپنے وطن لوٹی تھی۔ اسی امید پر کہ شاید کوئی صورت ضمیر کی خلش دُور کرنے کی بنے۔ شاید تصوّرات کے صنم خانے میں صورت گری کی کوئی راہ نکلے وہ کسی ایسے زخم کے لیے مرہم فراہم کر سکے جو اس کا اپنا لگایا ہوا ہے۔ کسی اُجڑے درخت کو سینچنے کا سامان کر سکے۔

ایک آس تھی خشک لب تر ہونے کی۔ جلتی آنکھوں کی خنکی سے ہم آغوش ہونے کی جو اُسے دس سال بعد یہاں کشاں کشاں لے آئی تھی اور خوف

تھا حقیقت کو نظروں کے سامنے دیکھنے کا۔ اسی لیے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔
جسم کانپ رہا تھا اور کانوں میں سنسناہت سی ہو رہی تھی۔ اس سنسناہٹ میں ایک مانوس سرگوشی بھی شامل تھی اور جانی پہچانی سانسوں کی گرمی بھی، ماحول اجنبی اجنبی سا تھا، لیکن اس میں رچی ہوئی سرسراہٹ بالکل اپنی اپنی سی لگ رہی تھی اور اسے اسی اپنائیت کے بے آواز زیر و بم سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

اسٹیشن سے بوجھل بوجھل سی باہر نکل کر وہ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی بہت کچھ بدل گیا تھا۔ لیکن اب بھی کچھ باقی تھا اور یہی "کچھ" اس کے حواسوں پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ جس حوصلے سے یہاں آئی تھی وہ ہر قدم پر ٹوٹتا سا لگ رہا تھا۔ ایک تذبذب تھا جو کبھی آنے پر ملامت کرتا اور کبھی اس کی نفی کرتا۔

وہ گومگو کیفیت میں دیر تک اسی طرح کھڑی رہی کہ ایک کرخت سی آواز سے بُری طرح چونک پڑی "میم شاف! ٹیکسی چاہیے؟"

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلتے نکلتے رہ گیا "نہیں" لیکن وہ سنبھل گئی اور سر گھما کر اس آواز دینے والے کی طرف دیکھا۔

ایک کالا بھجنگ ناٹے قد کا ٹیکسی ڈرائیور اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگا رہا تھا۔ شاید سوچ رہا کہ یہ کوئی مخبوط الحواس عورت ہے جو گھر کا راستہ بھول گئی ہے یا شاید یہ سوچ رہا تھا کہ گھر سے بھاگی ہوئی کوئی کنواری یا بیاہتا ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے اس طرح ٹک ٹک دیکھنے سے وہ لرز سی گئی۔ معاً اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی نرمی دیکھ کر اس کا دل ٹھہر گیا۔

"ہاں۔ہاں! چاہیئے۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی پھر پوری طرح سنبھل کر کہا: "اور یہ سامان بھی رکھ دو۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے جھک کر اس کا سوٹ کیس اٹھایا اور اُسے ٹیکسی کی ڈکی میں رکھ کر اس کی طرف پلٹا جو اپنی جگہ پر جامد کھڑی تھی۔

"کہاں جانا ہے میم شاف؟" ٹیکسی ڈرائیور نے مجسّم خدمت ہو کر پوچھا۔

"کہاں!...." اس سوال پر وہ کچھ لرزی کچھ بوکھلائی۔کیا بتائے کیا جواب دے؟ ٹیکسی ڈرائیور سے کیسے کہے کہ وہ نہیں جانتی کہ اسے کہاں جانا ہے اور یہ کیوں بتائے کہ وہ اپنی منزل کا نام نہیں بتانا چاہتی۔اسی تذبذب نے اُسے چند لمحے گم سُم رہنے پر مجبور کر دیا۔

"میم شاف"....." حیرت زدہ ڈرائیور نے اُسے جگانے کی کوشش کی۔" آپ.....کہاں.....؟"

"آں...." وہ چونکی ...." وہ قبرستان...."

"قب.... قبرستان؟" ٹیکسی ڈرائیور نے اُسے یوں گھورتے ہوئے کہا۔جیسے اسے اس کے پاگل پن میں اب شبہ نہ رہ گیا ہو۔

"ہاں! قبرستان چلو۔" اس کی خود اعتمادی عود کر آئی اور وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"مگر میم شاف! وہ تو یہاں سے بہت دُور ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے جیسے بے بسی سے کہا۔

"تمہیں دُوری سے کیا؟" وہ تنک کر بولی۔"کرایہ سے دو چار روپے

زیادہ لے لینا۔"

"اچھا میم شاف"۔ ٹیکسی ڈرائیور نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر اس کے لیے ٹیکسی کی پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ وہ سمٹتی ہوئی بیٹھ گئی اور ٹیکسی چل پڑی۔

ٹیکسی ڈرائیور بار بار مڑ مڑ کر اس کے پریشان چہرے کو دیکھ رہا تھا کچھ دیر بعد اس کے دل میں ہمدردی چٹکیاں لینے لگی۔

"میم شاف! وہاں آپ کا کوئی رشتہ دار دفن ہے؟" اس نے جھجکتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"ہاں۔" ممتاز نے مختصر جواب دیا۔

موسم بڑا سہانا اور دل کش تھا۔ ہرے بھرے کھیت اونچی نیچی پہاڑی سڑک کے دونوں جانب لہلہا رہے تھے۔ دائیں جانب ناہموار کچی پگڈنڈیوں پہ اکّا دکّا مقامی باشندے اپنے مخصوص لباس میں نظر آجاتے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اس کے گالوں کو چوم چوم کر خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ مگر اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ ہوائیں اُسے زوردار تھپّڑ مار کر اور اُسے نفرت سے دیکھتی ہوئی گزر رہی ہیں۔ اپنے آپ کو اس صبر آزما ماحول سے چھٹکارا دلانے کی خاطر وہ دس سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گئی۔

خوبرو شہزاد ایک ہونہار مگر غریب طالب علم تھا۔ وہ ممتاز کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پسند کرتا تھا۔ مگر اس کی محبت گونگی تھی۔ اس کی چاہت کی کوئی زبان نہیں تھی۔ وہ ممتاز کا ایک ایسا خاموش پجاری تھا جس کا رازداں صرف اس کا اپنا دل تھا۔ متعدّد بار اس نے چاہا بھی تھا کہ اپنے

دل کی بات زبان پر لے آئے مگر ہمّت نہ پڑی ۔ وہ احساسِ کمتری کا بُری طرح شکار تھا۔ اور اندر ہی اندر اس کرب کو محسوس کر کے کراہ رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا۔ یہ کیفیت اس کی جان پر بن رہی تھی ۔

ممتاز ایک مال دار باپ کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی تھی لیکن شکل و صورت کے اعتبار سے گوارا بھی کہی نہ جا سکتی تھی۔ رنگت گہری سانولی تھی۔ یہ تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ لیکن چہرے پر چیچک کے داغوں نے اسے بدنما بنا دیا تھا اس کے باوجود اس میں غرور و تکبّر تھا اور یہ بلاوجہ نہ تھا۔ اُسے بخوبی احساس تھا کہ کوئی بھی لڑکا اُسے اپنے خوابوں کی شہزادی بنانا پسند نہ کرے گا۔ ہاں.. لیکن اس کی دولت سے بِک جانے کو ہر وقت تیار رہے گا۔ دولت کی اسی طاقت نے اُسے مغرور بنا دیا تھا اور وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی تھی وہ اپنے احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے بھی ایسا کرتی تھی۔ کیوں کہ بہر حال انسان.. ... ایک عورت تھی۔ جس کی سب سے بڑی خواہش چاہا جانا ہوتی ہے۔

اسی خواہش کی بنا پر وہ محرومی کی آگ میں جل رہی تھی۔ کسی کی محبوبہ بننے کی خلش اُسے تڑپائے رکھتی تھی ۔ چاہے جانے کا کرب اُسے چین نہ لینے دیتا تھا ہر لڑکی کی طرح اس کا بھی ایک آیُڈیل تھا۔ جو توانائی اور وجاہت کا نمونہ ہو۔ دل کشی کا مجسّمہ ہو ۔ ان سب باتوں کے باوجود اس کی فطرت میں رچی ہوئی انا نے اُسے لڑکوں کے نزدیک شجرِ ممنوعہ بنا کر رکھا تھا۔ اور اسی باعث شہزاد اس کے سامنے دل کی بات زبان پر لانے کی ہمّت نہ پاتا تھا۔

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی تھی ۔ شہزاد کو خدشہ تھا کہ کہیں ممتاز یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اس کی دولت کی وجہ سے اس کی پرستاری کا دم بھر رہا ہے ۔ کیونکہ

صاف ظاہر تھا کہ کوئی عام سا لڑکا بھی اس لالچ کے بغیر ممتاز کی طرف ملتفت
نہیں ہو سکتا تھا۔ بھلا ایسی شکل وصورت والی لڑکی من مندر کی دیوی کیسے
بن سکتی تھی۔

ممتاز نے اپنے فطری احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے خود کو تعلیم کے
لیے وقف کر دیا تھا۔ اور ذہانت اس شوق کو جِلا دے رہی تھی۔ اس نے ایم'بی'
بی'ایس' کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا اور مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلی گئی
وہاں کی فضا نے اسے کم از کم اس الجھاؤ سے آزاد کر دیا۔ جس میں وہ محصور تھی۔
یہاں ایسا کوئی آشنا نہ تھا۔ جس کے سامنے وہ خود کو کمتر محسوس کرتی۔ اس کے
برعکس وہاں کے طلباء اس کی ذہنی صلاحیت کے معترف ہونے کے ساتھ اس
کی ذات میں ایک خاص حد تک دل چسپی بھی لیتے تھے۔ کیوں کہ وہاں حُسن کا معیار
گوری رنگت نہ تھی اور نہ چیچک زدہ چہرہ نفرت یا تضحیک کا باعث نظر آتا
تھا۔ وہاں کی لڑکیوں سے مختلف ہونے کی بناء پر لڑکے اس میں کشش پاتے۔
لیکن وہاں بھی وہ لڑکوں سے اتنی ہی دور تھی جتنی اپنے وطن میں تھی۔
بلکہ وہاں کے لڑکوں کو وہ اس قابل ہی نہیں سمجھتی تھی کہ ان کے التفات کا جواب
مائل بہ کرم ہو کر دے۔ وہ محض ایک طالبہ کی حیثیت سے اپنی تعلیم کا عرصہ پورا کر رہی
تھی اور اس کے بعد اسے مردوں کی طرح زندگی کے میدان میں اترنا تھا۔ اس نے
خود کو جنسِ لطیف محسوس ہی نہیں کیا اور نہ لڑکوں کو اپنے بارے میں اس احساس
کو ہوا دینا چاہا۔

ایک روز وہ شام کو شاپنگ کرنے نکلی تو اچانک اس کی مڈبھیڑ
کالج کی ایک سہیلی سائرہ سے ہو گئی۔ سائرہ کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے

ہمراہ لندن آئی ہوئی تھی، یہ اس کے شوہر کا کاروباری دورہ تھا اور ساتھ ہی سیر سپاٹا بھی۔ اسی لیے سائرہ نے لندن میں اپنے قیام کو ایک پنتھ دو کاج بنایا تھا۔

دونوں خوب لپٹ لپٹ کر ملیں اور دم بھر میں ڈھیروں باتیں کر ڈالیں کالج کے ساتھیوں کی باتیں، مشترکہ سہیلیوں کی باتیں۔ ایک دوسرے کے گھر کی باتیں..... دیارِ غیر میں اپنا مشاہدہ اور تجربہ، ماضی سے حال میں آئیں اور مستقبل کی ٹوہ لینے لگیں۔ لیکن ماضی بہرحال اپنا وجود منواتا رہا۔ اچانک سائرہ بولی:

"ممتاز۔ تمہیں وہ شہزاد یاد ہے نا....؟"

"شہزاد ....؟" ممتاز نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا: پھر بولی۔ "ارے ہاں! وہ جو ہمارے ساتھ کالج میں تھا۔"

"ہاں وہی شہزاد۔" سائرہ نے افسردگی سے کہا۔

"کیا ہوا اُسے"؟ ممتاز نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"وہ پاگل ہو گیا۔" سائرہ نے پھر اسی گہری افسردگی سے کہا۔

"پاگل....؟" ممتاز حیرت سے بولی۔ "وہ اتنا غیر معمولی انٹیلی جنٹ اور سوبر لڑکا تھا۔ کوئی حادثہ گزرا کیا؟"

"ہاں! ایک حادثہ ہی اس پر گزرا اور وہ غیر معمولی انٹیلی جنٹ اور سوبر لڑکا ہوش کی دنیا سے عالمِ دیوانگی میں جا پہنچا۔"

"چ چ چ۔" ممتاز نے اظہارِ افسوس کیا۔ "کوئی خاندانی گڑبڑ تھی یا محبت وحبت کا چکر تھا؟"

جواب میں سائرہ نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا اور یوں بولی جیسے سرگوشی کر رہی ہو۔ "اُسے محبت لے ڈوبی..... تمہاری۔"

"میری !" ممتاز اچھل پڑی۔ "میری محبت میں..... وہ.... پاگل ہو گیا..... ؟"

"ہاں !" سائرہ نے دکھی لہجے میں کہا۔ "آج وہ زندہ درگور ہے۔ اپنوں بے گانوں کو پہچانتا نہیں بلکہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ خود کون ہے ؟"

ممتاز پر کئی لمحوں تک سکتہ طاری رہا۔ صرف اس کا ذہن تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ اپنے ماضی کے محور پر گھوم رہا تھا۔ جہاں اُسے کسی مرد سے بے لوث محبت کی توقع نہ تھی۔ جو بھی اس کی ذات میں دل چسپی لیتا نظر آتا تو اس کی وجہ اس کی دولت نظر آتی۔ ایک چیچک رو گہری سانولی رنگت کی لڑکی سے کون پیار کر سکتا تھا۔ ایسے میں کسی خوبرو لڑکے کا اس کے عشق میں پاگل ہو جانا اس کے نزدیک کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ یا خدا ! کیا معجزے اس دور میں بھی ہوتے ہیں۔

شہزاد کو اگر اس کی دولت سے پیار ہوتا تو وہ اپنی محرومی کو اتنی شدت سے محسوس نہ کرتا۔ بے شمار لوگ دھن دولت کے طلب گار ہوتے ہیں اور اگر وہ نہیں ملتی تو صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔ دولت کے لیے پاگل ہونے والوں کا بہت کم سُنا ہے۔ البتہ محبت میں جان دینے والوں کی داستانیں ہر رہ گزر پہ ملتی ہیں۔ ممتاز کو یقین تھا کہ شہزاد ان ہی لوگوں میں سے ہے جو جذبات کی صلیب اٹھا لیتے ہیں۔

سائرہ کہہ رہی تھی۔ "اسے پاگل خانے میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں دو سال تک اس کا علاج ہوتا رہا، لیکن اس کے سدھرنے کے آثار دکھائی نہ دیے بالآخر ڈاکٹروں نے کہا اگر اسے یقین دلا دیا جائے کہ..... ممتاز مر چکی ہے تو اس کے ہوش بحال ہونے کا امکان ہے۔ چناں چہ تمہاری ایک مصنوعی قبر بنا دی گئی لیکن اس کا بھی اس پر الٹا ہی ردّ عمل ہوا۔ اور اس نے قبر کے پاس ایک برگد کے پیڑ کو اپنا

مسکن بنالیا۔ دن رات وہیں رہتا ہے۔ کھانے، پینے اور پہننے اوڑھنے سے بے نیاز رہتا ہے۔ اکثر کچھ دوست آکر کھلا پلا دیتے ہیں ورنہ پڑا رہتا ہے۔ کبھی کوئی آکر کپڑے تبدیل کروا دیتا ہے، نہلا دیتا ہے لیکن وہ اُس جگہ سے ہٹتا نہیں ہے۔"

سائرہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی لیکن ممتاز اس کی باتوں کی پہنچ سے بہت دُور خلاؤں میں سفر کر رہی تھی۔ جو کچھ سائرہ نے بتایا تھا۔ وہ اُس کے تصوّر کی حدود سے بھی کوسوں دُور تھا۔ حیرت، دُکھ اور خوف کے ملے جُلے طوفان میں اس کی سوچ سمجھ کی ناؤ ہچکولے کھا رہی تھی پھر معاً اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ ایک غیر مبہم اور دو ٹوک فیصلہ۔

"میم صاحب! قبرستان آگیا ہے۔"

ڈرائیور کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔ اور وہ اپنے ارد گرد کا ڈرتے ڈرتے جائزہ لینے لگی۔

"کیا یہی قبرستان ہے؟"

"ہاں میم صاحب! وہ سامنے گیٹ ہے۔ اس سے آپ اندر جا سکتی ہیں"۔ .... "اچھا تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی لوٹ آؤں گی۔" وہ ٹیکسی سے اترتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے میم صاحب۔"

وہ پھاٹک میں داخل ہو رہی تھی تو اس کے سارے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ قدم اٹھ نہیں رہے تھے اور دل کا یہ عالم تھا کہ پسلیوں کا پنجرہ توڑ کر اڑ جائے گا فضا میں پھڑ پھڑائے گا اور پھر گر کر مر جائے گا۔ چاروں طرف لمبی چھوٹی گھاس کے درمیان نئی اور پرانی قبریں تھیں۔ کچھ بہت پرانی اور کچھ نئی لگتی تھیں۔ پرانی قبریں

زمین بوس ہو چکی تھیں اور ان کے مکینوں کی طرح ان کا نشان بھی مٹتا جا رہا تھا۔ نئی قبروں کی شکل بتاتی تھی کہ اب بھی مرنے والوں کے نام لیوا موجود ہیں۔

دوپہر شام میں ڈھلنے کو تھی اور چار سُو بے حد بھیانک سناٹا تھا۔ ایک وحشت تھی جو درختوں کے پتوں میں ناچ رہی تھی۔ خوف تھا جو خشک ٹہنیوں میں سرسرا رہا تھا۔ ممتاز سرتاپا پسینے میں شرابور تھی۔ اس لیے کم۔ کہ ہوا میں تمازت تھی اور اس لیے زیادہ کہ اس کا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔

وہ سہمی سہمی اپنی قبر تلاش کرتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ قدموں تلے روندے جانے والے خشک پتّوں کی چرُمراہٹ سے ٹھٹھک جاتی۔ کسی پرندے کی آواز سے اُچھل اُچھل پڑتی۔ اس گھمبیر سنّاٹے میں خود اس کے قدموں کی چاپ بھی ایک دھماکا لگتی تھی اور رہ رہ کر اٹھنے والے دھماکوں سے اس کے دماغ کی رگیں جھنجھنا اٹھتی تھیں۔

خاصی دیر بعد اس کی نظر ایک کتبہ پر پڑی اور وہ رُک گئی۔ ہاں یہ کتبہ اسی کے نام کا تھا۔ یہ قبر اسی کی تھی۔ زندگی کی تمام علامتوں کو لیے وہ اپنی قبر کے باہر کھڑی تھی کہ اس کے مدفن کا دروازہ اس پر بند تھا اور اگر کھلا بھی ہوتا تو کیا وہ اس کے اندر داخل ہو سکتی تھی؟ کیوں اور کیوں نہیں؟ اس کا فیصلہ اس کے ادراک سے باہر تھا۔

اپنا کتبہ پڑھتے ہوئے اس کی ایک آنکھ میں دکھ، دوسری میں خوف تھا...... سناٹے میں ایک نحیف آواز کراہ کے مانند ابھری تو وہ اُچھل پڑی اس نے وحشت بھری نظریں تیزی سے چاروں طرف گھمائیں تو داہنی سمت ایک کھچڑی داڑھی والا فقیر آلتی پالتی مارے بیٹھا نظر آیا۔ بے تحاشا بڑھے ہوئے کھچڑی

بالوں نے اس کے چہرے کے بڑے حصّے کو چھپا رکھا تھا۔ جسم پر ایک تہمد تھا اور ننگے سینے پر پسلیاں صاف گنی جا سکتی تھیں ممتاز کو اپنی قبر کے آس پاس شہزاد کی موجودگی کی توقع تھی لیکن وہ نہ جانے کہاں غائب تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اس فقیر کی طرف بڑھی۔

"بابا! یہاں سُنا ہے ایک پا..... "شہزاد کو پاگل کہتے ہوئے وہ جھجکی "ایک اللہ لوک رہتا ہے۔ اس کا نام شہ..... شہزاد ہے، کیا تم..... کیا تم اسے جانتے ہو بابا؟"

فقیر نے سر اٹھا کر اس کی طرف گھور کر دیکھا اور بولا: "تم کون ہو؟ اس کی کیا لگتی ہو؟"

"میں....." ممتاز گھبرا گئی۔ "میں اُس کی ایک عزیزہ ہوں بابا۔"

"وہ..... وہ تو مر گیا۔ فقیر نے بے پرواہی سے کہا اور ممتاز کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

"کب؟ وہ کب مرا بابا؟" اس نے جلدی سے کہا۔

"یہ تاج محل بننے کے بعد وہ مر گیا۔" فقیر نے ممتاز کی قبر کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا "اس میں اس کی ممتاز محل دفن ہے۔"

ممتاز کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ یہ سُن کر نہیں کہ شہزاد مر گیا بلکہ یہ محسوس کر کے کہ فقیر کو بھی ایک محبّت کی الم ناک موت کا صدمہ تھا۔ اس کی بات سے ظاہر تھا کہ شہزاد مرا نہیں ہے۔ اس کی محبّت مر گئی ہے۔

ممتاز نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے دس کا نوٹ نکال کر فقیر کی طرف بڑھاتے ہوئے بڑی ملائمت سے کہا "شہزاد ہو گا کہاں بابا؟"

فقیر نے حقارت سے نوٹ کو دیکھا اور غصّے سے چیخا۔ ”تم .... تم مجھے نوٹ دکھا رہی ہو؟ شہزاد کا پتہ معلوم کرنے کے لیے مجھے بھیک دے رہی ہو؟ چلی جاؤ۔ میری نظروں سے دُور ہو جاؤ۔ دولت والی عورت! شہزاد کا پتہ خریدنے آئی ہو؟ قبر میں بھی اس کی روح کو تڑپانے آئی ہو؟ اسی دولت نے اس کی ممتاز کو اس سے اتنی بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ وہ سر اٹھا کر اُسے دیکھ بھی نہ سکتا تھا اور اب اس کی قبر کا نشان پوچھنے کی بھی قیمت ادا کی جا رہی ہے۔“

ممتاز خفت کے مارے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اُسے معذرت کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ پھر بھی اس نے سہمے سہمے سے لہجے میں کہا:

”مجھے معاف کر دو بابا۔ میں اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے نوٹ والا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ کر سر جھکا لیا۔

”تم ہو کون؟“ بوڑھے نے آنکھیں سکوڑ کر اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک بدنصیب مجرم .....“ ممتاز نے سر جھکائے جھکائے دھیمی آواز سے کہا۔ ”یہ قبر میری ہم نام کی ہے۔“ اس نے ممتاز کی مفروضہ قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہاہاہا .....“ اچانک فقیر نے وحشیانہ طور پر قہقہہ لگایا۔ ”تو تم بھی ممتاز ہو! لو سنو ..... میں ہوں شہزاد، تاج محل کا خدمت گار

ممتاز بُری طرح چونکی۔ فقیر نے اب تک جتنی باتیں کی تھیں اُن سے اسے یہ یقین کرتے دیر نہ لگی کہ وہی شہزاد ہے۔ لیکن وہ خوبرو، گبھرو، شہابی رنگت، ستواں ناک شربتی آنکھوں والا شہزاد کہاں رہ گیا تھا... اور یہ بوڑھا، کھچڑی بالوں اور کھچڑی ڈاڑھی والا، سیاہی مائل گندمی رنگت، پچکے

ہوئے گال، دھنسی ہوئی ویران ویران سی آنکھیں.... نہیں.... یہ شہزاد نہیں ہے۔

"سچ سچ بتاؤ نا بابا!" اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "شہزاد اس وقت کہاں ہوگا؟"

"ممتاز" فقیر گرجا۔ "کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ کیا میں تمہیں شہزاد نہیں لگتا ہوں؟" معاً اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور اس نے سر جھکا کر بڑی دھیمی مریل آواز میں کہا۔ "اگر تم بھی ممتاز ہو تو تم کبھی میری بات پر یقین نہیں کرو گی ممتاز دولت مند تھی۔ اور دولت نے اُسے پہاڑ کی چوٹی پہ پہنچا دیا تھا۔ شہزاد غریب تھا۔ اُس تک پہنچنے کا تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا، وہ اظہارِ تمنّا کیا کرتا۔ اس کے دل نے اپنی آگ میں جل جانا ہی بہتر سمجھا، اور وہ چپ چاپ جلتا رہا۔ پھر ممتاز مر گئی اور سب کچھ مر گیا کالج کے در و دیوار مسمار ہو گئے، کتابیں ریزہ ریزہ ہو گئیں، سڑکیں کھائیاں بن گئیں اور بستیاں قبرستان بن گئے۔"

"تم... تم شہزاد ہو... تم واقعی شہزاد ہو۔" ممتاز تڑپ کر بولی۔ "مجھے یقین آ گیا کہ تم شہزاد ہو اور میں... میں وہی ممتاز ہوں، میں زندہ ہوں، میں زندہ ہوں شہزاد، میں تمہارے لیے زندہ ہوں۔"

"جھوٹ نہ بولو امیرزادی۔" شہزاد نے لال لال آنکھیں نکالیں۔ "مجھے دھوکا دینا چاہتی ہو؟ میری ممتاز تو اس قبر میں لیٹی ہوئی ہے اور وہیں سے میرے ساتھ باتیں کرتی ہے۔ وہ باتیں جو ہم نے کبھی نہیں کیں۔ وہ راز جو ہم نے ایک دوسرے سے چھپائے رکھا۔ اب ہم دونوں پہ آشکارا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور سیدھا جا کر ممتاز کی قبر پہ اوندھے منہ گر پڑا

ممتاز کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی ۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا ، اور قدم لڑکھڑا گئے ۔ جانے کس طرح وہ آگے بڑھی ۔ شہزاد کے پیر پکڑے اور اس پر ڈھیر ہو گئی ۔ شہزاد پلٹا اور اپنے قدموں میں پڑے ہوئے بے جان جسم کو دیکھتا رہ گیا ۔ ●●

۹، آگست ۱۹۷۹ء

مدراس

محترمی ایم۔ اے۔ مغنی صاحب

ایڈیٹر "فلم ایشیا" کراچی

سلام وخلوص!

امید ہے آپ عافیت سے ہوں گے۔...!

"فلم ایشیا" کے خوب صورت اوراق میں قید کرنے کے لیے "نجمہ" کو آپ کے حضور میں پیش کر رہی ہوں۔ امید ہے "نجمہ" کے حسنِ اخلاق اور جان دار کردار سے متاثر ہو کر آپ اسے کسی قریبی شمارہ میں پناہ دیں گے۔

مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ جس میں میری غزل: ؎

وہ کیا ملے کہ ایک زمانہ ملا مجھے

اپنی وفاشعاری کا بدلہ ملا مجھے

شائع ہوی ہے۔ جس کے لیے میں آپ کی تہ دل سے شکرگزار ہوں۔

حسبِ فرمائش چند اور غزلیں اور افسانے دس، پندرہ دنوں میں ارسال کر دوں گی۔ عزیزیہ بھائی نے بھی اس سلسلہ میں خط لکھا تھا۔

اور کیا عرض کروں۔ آج کل یہاں بارش ہونے کی وجہ سے

موسم بہت سرد پڑ گیا ہے اور ادبی مصروفیات میں بھی کچھ حد تک ڈھیل پیدا ہوگئی ہے۔ اس لیے کہ ٹھنڈ کی وجہ سے میرے ہاتھ میں درد کی شدت ہونے لگتی ہے اور پھر میں زیادہ کچھ نہیں لکھ پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں آپ کو 'نجمہ' کے بارے میں بھی مزید معلومات دینے سے قاصر ہوں۔ آپ افسانہ پڑھ لیں تو بہت کچھ آپ کو 'نجمہ' کے کردار کے بارے میں معلوم ہو جائے گا

بقیہ آئندہ خط میں۔

گھر میں متعلقین سے حسبِ مراتب سلام و دعائیں عرض کر دیں۔

خیر اندیش

صبا

نجمہ

جب کسی طرح بھی مس صوفیہ کا غم غلط نہ ہوا تو کالج کی تمام لڑکیوں اور پروفیسروں کے درمیان ایک پریشانی اور اضطرابی کیفیت پیدا ہوگئی ہر ایک کے چہرے پر مایوسی اور اداسی چھائی ہوئی تھی کلاس کا ماحول بھی بہت اداس اداس تھا۔ پروفیسر جب کلاس روم میں پڑھانے کی خاطر آتے تھے تو کلاس کا ناخوش گوار ماحول ان کو کلاس میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اور پھر وہ کچھ خاص ہدایت دے کر اسٹاف روم کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ یہ جان لیوا اور اداسی کا عالم تقریباً ایک ہفتہ سے پورے کالج پر طاری تھا۔

مس صوفیہ ہوسٹل میں مقیم تھی۔ حالاں کہ بچپن کے سارے گزرے ہوئے ایام اسی کرسچن ہوسٹل کی چار دیواری میں بسر کئے تھے۔ مس صوفیہ کے والدین کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ اور اس کے کون رشتہ دار تھے ان سب باتوں سے مس صوفیہ بالکل بے خبر تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے جو اکثر اُسے ہوسٹل میں دیکھنے آیا کرتا ہے۔ دو چار سال بعد لندن سے آرکیٹیکچر کی ڈگری لے کر یہاں آیا تھا اور بہت کم مدّت میں بے حد مشہور ہوگیا تھا۔ دو تین مہینے میں وہ ایک بار ضرور اپنی بہن صوفیہ کو دیکھنے ہوسٹل آیا کرتا تھا۔ ہوسٹل اور کالج کے سبھی لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ صوفیہ کا صرف ایک بڑا بھائی ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا کوئی رشتہ دار نہیں۔ لہذا

کالج اور ہوسٹل کے سبھی لوگ مس صوفیہ کے ساتھ بہت نرمی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے اور اس کا ہر طرح سے خیال رکھنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔

اب قریب ایک ہفتہ سے مس صوفیہ کا بُرا حال دیکھ کر ہر ایک کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہونے لگے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے مس صوفیہ کے بھائی کے ایک قریبی دوست کا ایک خط مس صوفیہ کے نام آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ "مس صوفیہ کا بھائی لاپتہ ہے۔۔۔! اس بُری خبر نے صوفیہ کی روح کو صدمہ پہنچایا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی اور بہت دیر بعد ہوش میں آئی۔ کالج اور ہوسٹل میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر ایک نے مس صوفیہ کو سمجھانا اور اس کا غم غلط کرنا چاہا مگر ہر کوشش بیکار اور بے سود ثابت ہوی۔

اس موقع پر ایک مسلم لڑکی مس نجمہ نے بھی مس صوفیہ کی دلجوئی کی۔ وہ صوفیہ کی کلاس میٹ تھی۔ وہ چال چلن کی بہت نیک، شریف، سادہ لوح اور پرہیزگار تھی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک غریب گھر کی چشم و چراغ تھی ــــ حسّاس طبیعت کی مالک ہونے کی وجہ سے صوفیہ کا تڑپنا اس سے دیکھا نہ گیا۔ وہ اسے دلاسہ دینے کی خاطر اس کے کمرے میں آنے جانے لگی۔ اس سے اچھی طرح باتیں کرتی اور اس کا دل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ یہی نہیں بلکہ اپنے خالی وقت میں خدا سے گڑگڑا کر دعائیں بھی مانگتی۔ اس کے کمرے میں اپنا بیشتر وقت گزارتی۔ پانچ وقت نماز بڑے خلوص اور عقیدت سے ادا کرتی اور گھنٹوں تسبیح لے کر وظائف پڑھتی رہتی اس کی حالت دیکھ کر صوفیہ بہت متاثر ہوی اور اس سے کہنے لگی: "نجمہ بہن!

جب سے تم نے میرے کمرے میں آکر پاکیزگی خلوص اور عقیدت سے عبادت کرنا شروع کی ہے، تب سے نہ جانے کیوں مجھے ایک طرح کا سکون سا محسوس ہو رہا ہے اور رہ رہ کر ایسا خیال آ رہا ہے جیسے میرا بھائی مجھے بہت جلد مل جائے گا۔ پلیز نجمہ ۔۔۔ ! مجھے بھی کچھ دعائیں بتاؤ تاکہ میں بھی تمہاری طرح کچھ پڑھ کر مزید سکون حاصل کر سکوں۔ !"

نجمہ اس کی باتوں کو بغور سنتی رہی اور پھر اس نے بڑے خلوص سے کہا ۔۔۔ "صوفیہ ! میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔ انشاءاللہ تعالیٰ تمہارا بھائی تمہیں بہت جلد مل جائے گا۔ اور تمہاری ساری پریشانی اور سارے غم دُور ہو جائیں گے۔ بشرطیکہ تم سب سے پہلے اپنے دل کے اندر یہ مصمّم ارادہ کر لو کہ "صرف ایک خدا ہے، جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا جو بہت پاک اور حکمت والا ہے۔ اور اپنے بندوں پر ہمیشہ رحم کرتا ہے کیا بادشاہ کیا فقیر سب اسی کے محتاج ہیں۔"

"نجمہ ! تم نے جو کچھ کہا ہے میرا دل کہتا ہے کہ وہ بالکل درست ہے۔ اور اب میں ایسا ہی سمجھوں گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو اب میرے اس عقیدے میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہو گا۔"

"کیا واقعی !" نجمہ نے اُسے تعجب سے دیکھا۔

"ہاں نجمہ ! میں درست کہہ رہی ہوں۔ جو کچھ تم پڑھتی ہو اس میں سے مجھے بھی کچھ سکھاؤ، کچھ بتاؤ، تاکہ میرا یہ عقیدہ اور ایمان پختہ ہو۔"

"اچھا تو میں تمہیں سب سے پہلے ایک کلمہ سکھاتی ہوں جس سے تمہارے عقیدے اور ایمان میں پختگی آئے گی اور تمہارے دل اور ذہن میں وسعت

اور پاکیزگی پیدا ہوگی۔"

صوفیہ نے اشتیاق سے کہا:

"نجمہ! پھر جلدی سے بتاؤ نا وہ کلمہ کیا ہے؟"

"ارے بھئی! اُسے کلمۂ طیب کہتے ہیں۔ یہ بہت چھوٹا سا اور بہت آسان ہے۔ ہر کوئی اسے آسانی کے ساتھ ازبر کرسکتا ہے وہ یہ ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

اب مس صوفیہ دن رات اس میں محو رہتی۔ اور دل ہی دل میں یہ کلمہ بار بار دہراتی تاکہ اچھی طرح ازبر ہو جائے ___ صوفیہ کی یہ نئی تبدیلی کالج کی لڑکیوں اور پروفیسروں سے زیادہ دنوں تک پوشیدہ نہ رہ سکی۔ بہت جلد ان کو بھی اس بات کا علم ہو گیا۔ اگرچہ انھیں تھوڑا بہت اطمینان حاصل ہوا کہ مس صوفیہ اب کچھ کچھ بحال نظر آ رہی ہے مگر ان کے اندر کچھ عجیب قسم کے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں مس صوفیہ نجمہ کی صحبت میں رہ کر اور اس کی باتوں میں آکر اپنا مذہب نہ بدل دے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا مس صوفیہ اور نجمہ ایک دوسرے کے قریب تر آنے لگیں۔ اب صوفیہ کو پورے چھ کلمے اچھی طرح ازبر ہو گئے تھے۔ نجمہ اس کی ذہانت اور کیفیت کو دیکھ کر اپنی سمجھ کے مطابق یہ دُعا سکھلانے لگی۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔

___ اور کہا کہ صوفیہ اس دُعا کا نام ہے "دُعائے یونس ؑ۔ یہ اسمِ اعظم ہے۔ جس کے پڑھنے کے بعد بڑی سے بڑی مصیبت دُور ہو جاتی ہے۔ اور اس نے صوفیہ کو حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ بتایا کہ انھیں مچھلی نگل گئی تھی تو انہوں نے

اسی دعا کا ورد کیا اور مچھلی نے انھیں اگل دیا۔

اب صوفیہ بڑے خلوص اور عقیدت سے یہ دعا نجمہ کے بتائے ہوئے طریقہ سے ہر روز پڑھنے لگی۔ ادھر کالج کے اندر ایک کہرام مچ گیا کہ نجمہ صوفیہ کی مجبوری اور حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُسے مسلمان بنا رہی ہے۔ اس کا اثر دوسری لڑکیوں پر بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا فوراً کالج سے نجمہ کو نکال دیا جائے۔

دوسرے دن کالج میں ایک مخصوص جلسے کا انعقاد ہوا۔ سب کی رائے تھی کہ نجمہ کو کالج سے نکال دیا جائے اور اس کے سرٹیفکیٹ میں لکھ دیا جائے کہ نجمہ کالج اور ہوسٹل کی لڑکیوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی لڑکی کو کسی کالج میں بھی داخلہ کی اجازت نہ دی جائے۔

صوفیہ کے بار بار کہنے، درخواست کرنے اور گڑگڑانے پر کہ نجمہ بالکل بے قصور ہے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے میرے اپنے کہنے پر عمل کیا ہے۔ اس معاملہ میں اس کا اپنا کوئی بھی ذاتی مفاد پوشیدہ نہیں تھا۔ اس کی دوستی، اس کا آنا جانا ـــ اس کی عبادت نے مجھے ایک طرح کا سکون بخشا۔ اس کی موجودگی مجھے اچھی لگی۔ اس لیے براہِ کرم نجمہ کو کالج سے نہ نکالا جائے ـــ مگر اس کی ایک نہ سُنی گئی اور نجمہ کو کالج سے نکال دیا گیا۔ وہ چلی گئی۔ غریب ماں باپ کی غریب سادہ لوح لڑکی اپنے سر پہ ناکردہ جرم کا الزام لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ وہ بہت اداس تھی اس لیے کہ اب صوفیہ کی غم خواری کون کرے گا۔ اس کا پرسانِ حال کون ہوگا ـــ ؟

ادھر نجمہ کے جانے کے بعد صوفیہ کی حالت اور بگڑ گئی۔ وہ بار بار

بے ہوش ہو کر گر پڑتی اور بہت دیر بعد ہوش میں آتی۔ اس کے غم میں اضافہ ہوا اور اس غم نے اُسے نڈھال کر کے بستر پہ لٹا دیا۔ ہوسٹل میں اس کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔

دو مہینے جوں توں کر کے گزر گئے اور پھر ایک دن اچانک صوفیہ کا بھائی آگیا۔ اُسے دیکھ کر صوفیہ کی دنیا ہی بدل گئی ـــــ اس کی خوشی انتہا کو پہنچ گئی اور وہ اپنے بھائی سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ اس کے بھائی نے باتوں باتوں میں بتایا کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں اپنی کار سے پاس کے شہر کو جا رہا تھا کہ اچانک ایک ٹرک سے اس کی کار بُری طرح ٹکرا گئی۔ وہ بالکل تنہا تھا مگر گاؤں کے لوگوں نے بڑے خلوص اور محبت سے اُسے بچا لیا اور اپنے گھر پر رکھ کر تیمار داری کی اور صحت یاب ہونے کے بعد انھوں نے رخصت کیا۔ اب میں آگیا ہوں۔ اب میں کبھی تم سے جدا نہیں ہوں گا۔۔۔۔۔ اور پھر صوفیہ نے وہ ساری باتیں تفصیل سے بتا دیں جو اس پر اس کے بھائی کے اکسیڈنٹ کے بعد گزری تھیں۔ اور نجمہ کے بارے میں بھی سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

دوسرے دن کالج اور ہوسٹل کی جانب سے صوفیہ کے بھائی کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا اور اس کے صحت مند ہو کر واپس آنے پر ایک شان دار پارٹی کا اہتمام بھی ہوا۔ اس دوران انھوں نے صوفیہ کے بھائی کو صوفیہ کی حالت اور نجمہ نے جو کردار ادا کیا تھا وہ سب اُسے بڑے فخر کے ساتھ سنایا گیا۔

سب کچھ سننے کے بعد صوفیہ کا بھائی اپنی سیٹ سے اٹھا اور

بہت ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا:

میرے محترم بزرگو اور دوستو! مجھے آپ لوگوں سے ایسی امید نہیں تھی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ لوگ بہت عظیم ہیں۔ صرف انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے کبھی یہ ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ میں اپنے بارے میں کھل کر آپ لوگوں کو کچھ بتاؤں۔ لیکن اب وقت آگیا ہے اس لیے میں بتا رہا ہوں:

میرا پورا نام ندیم چودھری ہے۔ دس سال پہلے میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ اُن دِنوں صوفیہ صرف چھ سال کی معصوم بچّی تھی۔ میں لندن میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ لندن میں ہمارے سارے خاندان کے لوگ مقیم ہیں۔ صرف ڈیڈی یہاں تھے۔ مگر بدنصیبی سے تقسیم ملک کے دوران وہ ایک حادثہ کا شکار ہو گئے۔ یہاں پر ہمارا کوئی بھی رشتہ دار نہیں تھا۔ لہٰذا میرے ڈیڈی کے ایک گہرے دوست نے صوفیہ کو آپ کے ہوسٹل میں رکھا۔ تاکہ وہ یہاں حفاظت کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کر سکے۔ مجھے انھوں نے اس سلسلے میں خبر کر دی تھی۔ میں صرف دو دِنوں کے لیے یہاں آیا، صوفیہ سے مِلا اور واپس لندن چلا گیا۔ . . . .
. . . . . . اس لیے صوفیہ کو کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مذہب کیا ہے۔۔ اس کے والدین کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے۔ وہ صرف مجھے ہی جانتی تھی۔ چار سال پہلے اس نے مجھے دیکھا تھا۔ جب میں لندن سے اپنی تعلیم مکمل کر کے یہاں آیا تھا۔

آپ لوگوں نے جس طرح چاہا اُسے رکھا۔ جو مذہب بتایا

اس نے قبول کیا۔ میں سب جانتے ہوئے بھی خاموش رہا۔ اس لیے کہ میرے نزدیک سب سے بڑا مذہب ہے محبت، انسانیت اور میل ملاپ کا.....!

جب تک ہمارے اندر آپسی بھائی چارہ اور پیار و محبت کا بھرپور جذبہ پیدا نہیں ہوگا، تب تک ہم مذہب کی اصلیت اور اس کے مقاصد کو سمجھ نہیں پائیں گے۔....!

انسانی رشتہ کا سمجھنا ہم سب کے لیے نہایت ہی ضروری امر ہے۔ اس لیے کہ رشتہ انسان کو انسان سے ملاتا ہے۔ یہ کڑی محبت کہلاتی ہے۔.... جب ایک بچّہ جنم لیتا ہے اور جب وہ بولنا سیکھتا ہے تو اس کی زبان سے سب سے پہلے "ماں" کا لفظ نکلتا ہے یعنی محبّت کا لفظ.....! جس میں ایک اثر ہوتا ہے۔ ایک پہچان ہوتی ہے۔ ایک جذباتی و پاکیزہ رشتہ کا بھرپور احساس ہوتا ہے....!

وہ سب سے پہلے "اللہ"...."بھگوان" یا "جیسس" کہہ کر کیوں نہیں مخاطب ہوتا......؟!

آپ لوگوں نے ایک غریب مذہبی قسم کی معصوم لڑکی کی سادہ لوحی اور مذہبی جذبہ کو دیکھ کر اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے اور یہ کہا کہ اس نے میری بہن کو مسلمان بنانے کی کوشش کی اور اُسے کالج سے نکال دیا۔..... آپ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری بہن مسلمان ہے، اس کا نام صوفیہ ہے۔ مگر آپ نے صفیہ ہٹا کر اُسے صوفیہ بنا دیا...... اور اپنے مذہب پہ چلایا.... میں نے تو

کبھی بھی کچھ بھی نہیں کہا کہ آپ نے اُسے صوفیہ کیوں بنایا.... ؟

یہ کہتے کہتے اس نے ایک گہری سانس لی۔ اور پھر سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا..... حضرات! میں بس اتنا ہی کہوں گا کہ مذہب اپنی جگہ ہے..... ہمیں مذہب کی آڑ لے کر سماج میں نفرت کی چنگاری نہیں سلگانی چاہیے..... بلکہ اگر ہم مذہب کے سہارے محبت و بھائی چارے اور انسانیت کا پیغام دیں تو ساری دنیا میں محبت کی حکومت ہوگی اور امن و امان کا سازگار ماحول ہوگا..... ورنہ ایک دن ایسا آئے گا کہ ساری دنیا میں انسانوں کی نہیں بلکہ وحشیوں اور درندوں کی حکومت ہوگی......

یہ کہنے کے بعد ندیم اپنی بہن کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر نکل آیا...... دوسرے لمحے ان کی گاڑی نجمہ کے گھر کی طرف فراٹے بھرنے لگی..... ••

۲۷ر آگست سنہ ۱۹۷۹ء

مدراس

محترمی انیس دہلوی صاحب!

تسلیمات!

آپ کے خط سے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ میرا سفر نامۂ حجاز "پہاڑوں کے دامن میں" آپ کو مل گیا ہے۔..... خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے ...... ورنہ آپ کے جواب نہ آنے پر میں متفکر تھی اور یہی سوچ رہی تھی کہ کہیں میرے افسانوں کے پارسل کی طرح کتاب کا پارسل بھی ڈاک کی بد انتظامی کا شکار تو نہیں ہو گیا۔ اس سلسلہ میں میں آپ کو خط تحریر کرنے ہی والی تھی کہ آپ کا خلوص نامہ باعثِ مسرت ہوا۔ مگر آپ نے خط میں یہ نہیں بتایا کہ افسانوں والا پارسل آپ کو ملا کہ نہیں؟ اگر اب تک وہ پارسل آپ تک نہیں پہنچا تو پھر یقیناً اِدھر اُدھر چلا گیا ہے۔ اب اس کے ملنے کی امید رکھنا میرے خیال میں فضول ہی ہے۔!

لیجیے ایک نیا افسانہ "احساس کا آئینہ" رسالہ "فلمی ستارے" کے لیے میں نے حال ہی میں لکھا ہے۔ یہ افسانہ پورٹ بلیر (انڈمان) کا ایک سچّا واقعہ ہے۔ اس کہانی میں حالاں کہ کوئی نئی بات نہیں ہے، کوئی اچھوتا پن نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس میں وہ بات ہے جس کی ضرورت آج زمانہ کو ہے۔ زمانے کی نئی نسلوں کو ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے نئی نسلوں کو زندگی کی سچائیوں سے روشناس کروانے کا۔ بھٹکی ہوئی نسلوں کو صحیح راستہ دکھانے کا۔ یہ ایک سنگ میل کی حیثیت

رکھتا ہے۔

کمسن اور نازک کلیاں جس طرح اپنے شباب پر نازاں ہو کر ہواؤں سے آنکھ مچولی کھیلا کرتی ہیں اور اپنی نادانی کی بنا پر تیز جھونکوں کے تھپیڑوں میں آکر اپنی ڈالی سے ٹوٹ جاتی ہیں اور زمین پر گر کر اپنا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھتی ہیں! ..... بالکل اسی طرح اگر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بھی ہوش سے کام نہ لیں اور جھوٹی شان و شوکت کی چمکتی دمکتی دنیا میں کھو جانے کی آرزوئیں رکھیں تو کبھی اپنی زندگی کو ایک مثالی زندگی تو کیا ایک کامیاب زندگی بھی نہیں بنا سکتے۔

اس ضمن میں، میں یہی کہوں گی کہ اکثر والدین کی بے پرواہی سے بچّے بہک جاتے ہیں اور گناہ و جرم کی دلدل میں ایسے پھنستے ہیں کہ وہاں سے باہر نکلنا ان کے لیے محال ہو جاتا ہے۔

میرے اس افسانہ کی والدہ بہت ہی نیک مزاج اور ہوش مند ہے۔ تب ہی تو کوثر نے بہت جلد اپنے بالک ہٹ کو تیاگ دیا..... گھریلو تعلیم خواہ وہ اچھی ہو یا بُری اس کے اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ بچّے بہت ہی جلد اسے قبول کر لیتے ہیں۔!

نواز آپ کو سلام لکھوا رہے ہیں۔ .... امید ہے آپ اچّھے ہوں گے ___!

خلوص کار

صبا

احساس کا آئینہ

کوثر کی بے جا ضد دیکھ کر اس کی امی کا ذہن مفلوج ہونے لگا
اُن کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ اٹھیں۔
جب سے کوثر نے اپنی امی کو یہ بتایا کہ وہ یاسمین کی شادی میں بنارس
کی گلابی ساڑھی اور نورتن کا سیٹ پہن کر جانا چاہتی ہے۔ اس کے کالج کی تمام
سہیلیاں بنارس کی ساڑھی اور نورتن کا سیٹ پہن کر جائیں گی۔ وہ بھی کسی
صورت میں اپنی سہیلیوں سے کم نہیں رہنا چاہتی۔ اپنی حیثیت کا ڈنکا وہ بھی
خوب کس کر بجانا چاہتی ہے۔ خواہ یہ نمائش ظاہرداری پر ہی مبنی کیوں نہ ہو.....
اور تب سے اس کی امی کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔...... شادی
کی تقریب ایک ہفتہ بعد شہر کے سب سے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل میں منعقد
ہونے والی تھی۔ حالاں کہ اگر کوثر کی امی چاہتیں تو کوثر کی خواہش پوری کر سکتی
تھیں۔ مگر وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس کم سنی میں کوثر کی بے جا اور فضول
خواہشات پوری کر کے اُسے دھوکے میں رکھا جائے۔ حقیقت سے دُور اور
نمائشی دُنیا کے قریب لایا جائے۔ اگر اس طرح اس کی ہمت افزائی ہوتی
رہی تو اس کا مستقبل بھیانک صورت اختیار کر لے گا۔ یہ سوچ سوچ کر
اس کی امی ایک گونہ کرب سے تڑپ اٹھیں..... ایک زخمی ہرنی کی طرح

ایک گھائل پرندہ کی مانند .....

پھر اچانک ان کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی۔ سیاہ گھنگھور رات میں جیسے انھیں کہیں سے ایک مدھم سی روشنی نظر آئی ...... اور وہ کوثر کو فوراً اپنے قریب بلا کر بڑی شفقت و محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ممتا بھری گلوگیر آواز سے کہنے لگی .....

"بیٹا کوثر! ..... تمہاری آج کی حالت اور ضد دیکھ کر مجھے میرا گذرا ہوا زمانہ یاد آرہا ہے ......"

"جب میں قریب نو سال کی تھی ..... بہت ضدّی واقع ہوئی تھی۔ والدین کی اکلوتی، نازوادا سے پرورش پائی ہوئی لڑکی، ماں باپ کے دلوں کا چین اور نگاہوں کی ٹھنڈک تھی، لیکن وہ بالک ہٹ، مشہور ہے یعنی میری ضد میرے والدین بہ خوشی برداشت کرتے تھے ..... مگر میری ماں کو دن بہ دن بگڑتی ہوئی میری عادتیں بالکل پسند نہیں آتی تھیں ...... رہ رہ کر دوسروں کی چیزوں کو دیکھ کر طلب کرنا، ماں کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا انھوں نے کئی بار پیار سے سمجھایا ..... منایا ..... مگر میں کہاں اپنی عادت سے باز آنے والی تھی۔ اپنی عادت کو اپنائے رہی۔!

ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ ہمارے اسکول کا سالانہ جلسہ تھا اس میں مجھے بھی انعام ملنے والا تھا۔ میں نے ماں سے ایک نئے فراک کی خواہش کی ...... اپنی سہیلیوں کا تذکرہ کرتے کرتے بتایا کہ وہ سب بہت اچھے اچھے فراک پہن کر آئیں گی۔ ..... ماں نے سب کچھ بڑے غور سے سنا۔ مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالیں اور پھر خاموش ہوگئیں۔ اس وقت ماں خلافِ معمول بے حد

اداس لگ رہی تھیں۔ مگر میں کہاں اس وقت ان کی اداسی کا مطلب سمجھ کر خاموش ہو رہتی۔ میں تو اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اور سارا دن کچھ نہ کھا کر روتی رہی۔

رونا اور آنسو بہانا ماں کو بالکل اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ انھیں میں نے کبھی روتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ خاموشی ان کی فطرتِ ثانی تھی اور صبر اُن کے کردار کا ایک نمایاں جوہر تھا۔ ان کی طرح صابرہ خاتون میں نے کہیں بھی نہیں دیکھی۔ مگر اُن دنوں میں اس قدر ناسمجھ واقع ہوئی تھی کہ اُن کے سارے جذباتِ بیکراں اور خوبیوں کی انتہا سے بالکل ناآشنا تھی اور اپنی دھن پر اپنا راگ الاپنا میری فطرت میں شامل تھا۔ مگر اب جب کہ وہ زمانہ ..... وہ ماحول اور وہ حالات اور ماں کی یاد آتی ہے تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ اُن کی صبر آزما فطرت خداداد تھی۔ تب ہی تو خُدا اُن سے بے حد خوش تھا۔

ماں صبر پر صبر کر کے بالکل مطمئن اور خوش نظر آتی تھیں۔ شکوہ شکایت کو وہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری قرار دیتی تھیں۔ خاموشی کو وہ اپنی زینت اور صبر کو وہ اپنی زندگی کا سب سے خوب صورت عطیہ تصوّر کرتی تھیں۔ تب ہی تو ان کی زندگی پُرسکون تھی۔ اگر شاعرہ ہوتیں یا ادیبہ ہوتیں تو آج دنیائے ادب میں اُن کا نام سرِفہرست ہوتا۔ اور رہتی دنیا تک لوگ انھیں بڑی عزت اور بڑے فخر سے یاد کرتے ......

آج ماں کی یاد بہت آرہی ہے۔ اُن کی ہر نصیحت میرے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر مجھے دیوانہ بنا رہی ہے۔ اُن کی معصوم تصویر نگاہوں کے سامنے رقص کر رہی ہے۔ کاش آج میرے پاس ہوتیں تو مجھے اپنی نصیحت پر عمل پیرا ہوتے دیکھ

کر بے حد خوش ہوتیں .... میں بالکل مطمئن ہوں۔ خوش ہوں۔ چوں کہ میں نے اپنی ماں کا دِل نہیں توڑا۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں۔ یقیناً میرا خُدا بھی مجھ سے خوش ہوگا۔

جانتی ہو کوثر بیٹی.......... ماں نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ ماں نے مجھ سے کہا تھا: "دیکھو رضیہ بیٹے۔! یہ ہماری جو زندگی ہے یہ جاوداں نہیں ہے۔ زندگی کا دوسرا نام فانی ہے، صرف فانی۔ جو کبھی بھی کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ یہ دنیا ایک فریب ہے۔ دھوکا ہے۔ اس لئے تو ظاہری رکھ رکھاؤ کا بُری طرح شکار ہے اگر زندگی کو فریب کی طرف اور لے جانا چاہتی ہو تو دنیاوی چمک دمک میں کھو کر بربادی کی طرف بڑھ جاؤ۔ پھر اس کے بعد کوئی بھی تمہارا نام نہیں لے گا..... اگر اپنا نام اور خاندان کی عظمت کا ذرا برابر بھی پاس ولحاظ ہے تو زندگی کو بہت آسان اور سادے ڈھنگ سے استعمال کرو۔ ورنہ زندگی تم پر بار ہو جائے گی.......

..... انسان خواہشات کا ایک مجسمہ ہے۔ جس میں ہوس کا رنگ ہر طرف سے نمایاں ہے۔

ان مجسموں میں سے اگر کوئی بھی مجسمہ اپنے نفس کو مار کر حقیقت کی طرف گامزن ہوتا ہے تو وہ سدا خوش اور کامیاب رہتا ہے۔ اور ہر دَور میں زمانہ کی نظر ایسی شخصیت اور اس کے کردار پر پڑتی ہے۔

بہر حال جب ماں میری ضد اور خواہشات سے بیزار آ گئی تو وہ بہت دُکھی رہنے لگیں۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے کہا...... بیٹی یہ بات گرہ میں باندھ لو۔ یہ تمہارے مستقبل کی پونجی ہے۔ تمہارا مستقبل سازگار اور خوش گوار ہوگا۔

"دوسروں کے کھانے دیکھ کر اس قسم کے کھانے کبھی طلب نہ کرنا دوسروں کے لباس دیکھ کر ویسے لباس کی خواہش ظاہر نہ کرنا۔ دوسروں کے ہُنر دیکھو اور سیکھو۔ اسی میں بھلائی ہے۔ اسی میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اور یہی جینے کا سلیقہ اور ایک جائز کوشش ہے۔ ....."

اس کے بعد ماں کو پھر کبھی مجھ سے کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔

کوثر انتہائی انہماک سے اپنی امی کی باتوں کو سُن رہی تھی۔ یک لخت آنکھوں کے جام آنسوؤں سے بھر آئے اور پھر چھلک کر دامن کو تر کرنے لگے۔

"امی جان مجھے معاف کر دیں۔ اب کبھی میں آپ کا دل نہیں دُکھاؤں گی ...... اب مجھے بنارس کی ساری اور نورتن کا سیٹ نہیں چاہیئے۔ آپ جو کچھ بھی دیں گی میں بہ خوشی قبول کر لوں گی۔!

اور پھر اس کی امی نے اُسے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ میری بچّی! مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم نے مجھے خوش کر دیا۔... خدا تمہیں خوش رکھے۔!

۲۶ر مارچ سنہ ۱۹۸۰ء

مدراس

محترمی شاہد بھائی صاحب

سلام مسنون!

ابھی ابھی آپ کا خط پوسٹ مین نے لاکر دیا۔ آپ کے پچھلے خط کا جواب ہیں لکھ نہ سکی۔ آج کل یہاں ملیریا کی وبا چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جہاں دیکھو لوگ ملیریا کے شکار ہیں۔ ہمارے گھر میں بھی سبھی کو یہی شکایت لاحق ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ کیپٹن صاحب اس وبا سے محفوظ ہیں۔ ورنہ ہمیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ کل ہی وہ میڈیکل چیک اپ کے لیے حیدرآباد جا رہے ہیں ـــــ یہ میڈیکل والے بھی بڑے ظالم اور بے حس ہوتے ہیں۔ ذرا سی خرابیٔ صحت پر چھ ماہ کے لیے پائلٹ کو گراؤنڈ کر دیتے ہیں۔ اور جب تک اُن کا شک دور نہیں ہو جاتا پائلٹ بے چارے پرواز ہی نہیں کر سکتے۔ یعنی اس وقت تک انھیں صرف تنخواہ ہی ملتی رہے گی۔ وہ بھی آدھی سے زیادہ انکم ٹیکس کی نذر ہو کر ...!

خیر! "تیز گام" کے لیے "صدقہ" بھیج رہی ہوں۔ یعنی اس صدقہ کے بعد "تیز گام" کو کسی کی بھی بُری نظر نہیں لگے گی۔

اور "تیز گام" اور تیزی سے آگے ہی آگے کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔

"صدقہ" کی ہیروئن بدقسمتی سے زمانے کی بے ہودہ اور بے ڈھنگے دستور کے مضبوط شکنجے میں اس قدر جکڑی جاتی ہے کہ اس گرفت سے چھٹکارہ پانے کے لیے اسے اپنے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر اپنی بہنوں کا صدقہ دینا پڑتا ہے۔ تاکہ اس کی بہنوں کا صدقہ بھی اتر جائے اور رسمِ سماج بھی ادا ہو جائے ـــ!

"صدقہ" آپ کو پسند آئے گا۔ صدقہ کی خاصیت اور انفرادیت یہ ہے کہ اس افسانے کی تحریر کا ہر لفظ بولتا ہے اور یہ بولتے بولتے رو دیتا ہے۔ میں بھی اس وقت بہت حساس ہو گئی تھی جب میں نے اسے لکھا تھا۔ مجھے اس وقت ایسے لگا جیسے شاید یہ میری اپنی کہانی ہو۔ اپنی ہی آپ بیتی ہو، میرا اپنا ہی ماضی ہو، اور پھر میں بہت دیر تک اپنے مجسم وجود کو گہرے سناٹے میں ڈبوئے دُور بہت دُور خلاؤں میں کھوتی چلی گئی ـــ جیسے مجھے اس دور دھند لکے میں کسی چیز کی تلاش ہو۔ مگر میں کِسے تلاش کر رہی تھی مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔......

کوئی سوال تھا جو میرے اطراف گھوم رہا تھا۔ میں جو کچھ پوچھنا چاہتی تھی کچھ معلوم کرنے کی متمنی تھی...... شاید! یہی کہ دنیا کیا ہے! کیوں ہے؟ کائنات کو بنانے والی ایک عظیم طاقت ہے مگر ہے کہاں؟ انسان کی تخلیق کیوں ہوئی! انسانی زندگی کا اصل مقصد کیا ہے۔ کیا زندگی دوسروں کی امانت ہے۔ یا پھر زندگی خُود جیئے جانے کا نام ہے .... یا زندگی آخر چاہتی کیا ہے؟..... تشدّد، انقلاب، انتقام

صبر و خاموشی یا پھر قربانی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

شاید اس کا جواب آپ کو صدقہ میں ملے گا ۔ ۔ ۔ ۔ !

جواب کا انتظار رہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ امید ہے آپ عافیت سے ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

آپ کی مخلص بہن

صباحت

صدقہ

اچھی آسیہ.....! کیسی ہو....؟

میں بھی بس ٹھیک ہی ہوں.....!

تمہارے خطوط سے اکثر مجھے ذہنی سکون ملتا ہے.....آج بھی تمہاری تحریر سے ایک طرح کا سکون نصیب ہوا ہے۔ مگر گزرے ہوئے دنوں کی ساری یادیں تازہ ہو کر دل و دماغ کی مہین اور نازک پردے پر اُبھرنے لگی ہیں...... بھلا کوئی بچپن کے بیتے ہوئے سنہرے شب و روز بھی اپنے دماغ سے باہر نکال پھینک سکتا ہے۔ لیکن تمہیں یہ بیٹھے بٹھلائے کیا سوجھی کہ مجھے نیک دعاؤں سے نوازنے لگی ہو.....! خدارا..... مجھے ایسی دعائیں نہ دو جن دعاؤں سے مجھے ڈر لگتا ہے۔.... نہیں آسیہ نہیں.... اتنی سخت سزا نہ دو..... یہ تمہاری ساری دعائیں میرے وجود کو جلا کر راکھ کر دیں گی۔ میرے ارمانوں پر پانی نہ پھیرو آسیہ! میری عبادت وریاضت کو اپنی پُراثر دعاؤں سے برباد نہ کرو۔ میری زندگی جو ایک طور کو سنبھالنے کی عادی ہو چکی ہے اب اسے کوئی دوسری روش اختیار کرنے پر مجبور نہ کرو.... ورنہ..... ورنہ تم اچھی طرح جانتی ہو میرا فیصلہ......

کیا تم چاہتی ہو کہ میں جس حال میں خوش اور مطمئن ہوں وہ

بالکل ختم ہو جائے ......! تم اپنی اور عادل کی خوشنودی کے لیے میری دنیا برباد نہ کرو۔ ورنہ تمہاری نفیسہ مر جائے گی جس کے تم اور عادل ہمدرد اور مہربان ہو.....!

میں جانتی ہوں تمہارا اپنا ایک چھوٹا سا گھر ہے۔ تمہاری اپنی ایک مسکراتی ہوئی دنیا ہے۔ تمہارا پیار کرنے والا شوہر اور معصوم خوب صورت بچے ہیں اس کے باوجود تمہاری تمام تر توجہ میری ایک ذات پر آ کر ٹھہر گئی ہے۔ مگر آسیہ! کیا ہماری یہ چند روزہ زندگی صرف اپنے ہی لیے ہے۔؟ کیا دوسروں کے لیے نہیں! زندگی کا فلسفہ تو یہی ہے کہ زندگی صرف دوسروں کی امانت ہے۔ دوسروں کے لیے جیو اور دوسروں کے لیے مرو ورنہ ایسی زندگی جو صرف اپنے ہی لیے گزرتی ہے، بے کار...... بے فائدہ اور... بے معنیٰ ہے.....!

آسیہ! تم مجھے دولہن کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہو..... اپنی بھابی بنانا چاہتی ہو..... یہی نا..... یقین کرو ایک دن دولہن کے روپ میں ضرور دیکھو گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے اور تم جانتی ہو کہ جب میں وعدہ کرتی ہوں تو وعدہ کا لحاظ بھی رکھتی ہوں۔!

تمہارے اس خط میں قریب ہر جگہ جلی حرفوں میں عادل ہی نظر آ رہا ہے... آسیہ! عادل کی یاد نہ دلاؤ..... گزرے ہوئے دنوں کی یاد سے زخم پھر رسنے لگے گا..... ایسا نہ ہو کہ یہ ناسور بن جائے .... مجھے معلوم ہے کہ عادل امریکہ سے آ گیا ہے۔ اور میری ہی خاطر وہ ابھی تک اپنی زندگی کو تنہائی کی آگ میں جھلسا رہا ہے۔ مگر ایسا کیوں ہے کیا اس نے

.....؟ مجھ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ عادل نے میری ذات کو بہت اہم اور افضل سمجھا اور ابھی تک شادی نہیں کی۔ دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں۔ آج ہر گھر میں دو تین لڑکیاں ضرور نظر آئیں گی۔ ہاں اچھے اور برسرِ روزگار نوجوان یقیناً نہیں ہیں۔ اور پھر عادل جیسے نوجوان ..... ہر لحاظ سے خوب صورت یقیناً عادل آج کے دَور کے لیے ایک نایاب اور کم یاب نوجوان کا نام ہے..... خُدا کی قسم آسیہ! عادل پر مجھے فخر محسوس ہو رہا ہے.....!

آسیہ! تمہیں تو معلوم ہے کہ میری تین بہنیں ہیں۔ دو کی شادی خُدا خُدا کر کے اچھی طرح اور اچھی جگہ ہو چکی ہے۔ دونوں اپنی اپنی سسرال میں خوش ہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ اس دورِ حاضرہ میں جہیز نے لڑکی والوں کے گھروں میں ایک ناسور سا پیدا کر دیا ہے۔ کم از کم غریبوں کے لیے اس معاملہ کی تردید نہایت ہی ضروری ہے۔

ایک اور بہن فرزانہ ماشاء اللہ شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہے۔ اب اس کی شادی بھی بہت جلد ہو جائے گی۔ فرزانہ کا جہیز بھی جمع ہو گیا ہے۔ اب کچھ ہی مہینوں میں یہ نیک کام بھی تکمیل کو پہنچ جائے گا۔.....عادل جیسا نوجوان اگر آج ہمارے سماج میں پیدا ہو گیا تو پھر کیا مجال کہ لوگ لڑکیوں کے سروں پر سفیدی کی لکیر بڑھنے لگیں.....

خیر.....! آسیہ! میری ذمہ داریوں میں خدا کے لیے الجھن پیدا نہ کرو۔ مجھے مجھ تک ہی رہنے دو۔..... ایسی حالت میں میرے دِل و دماغ کو بڑا سکون و آرام نصیب ہوتا ہے۔ میری اس دنیا میں ایک الگ

دنیا نظر آتی ہے۔ بالکل ہی الگ جس کا اندازہ شاید تم نہ لگا سکو.....!

گزرے ہوئے دنوں کی بات اور تھی اور وہ زمانہ اور تھا۔ خیالات اور تھے۔ ہم اور تھے۔ ہر طرح سے بے فکر..... آزاد... نہ کوئی غم نہ تردّد! نہ ذمّہ داری نہ کوئی احساس! مجھے کیا معلوم تھا کہ میری زندگی کے آنے والے دن کتنے انوکھے اور راتیں کتنی نرالی ہوں گی۔ اگر ایسا معلوم ہوتا تو میرا معصوم اور نادان دل کبھی عادل کو اپنے پاک خیالوں کی حسین دنیا میں آنے کی اجازت نہ دیتا۔ میری روح اپنی گہرائیوں میں کبھی عادل کی بے پناہ محبّت کو نہ سماتی۔ مگر..... !وقت وقت کی بات ہے۔ وقت نے کس کا ساتھ دیا جو ہمارا ساتھ دے گا.... !

آسیہ! اب تو عمر کے اس دَور میں قدم رکھ چکی ہوں جہاں بالوں پر سفیدی کی لکیریں نمایاں طور پر نمودار ہونے لگی ہیں۔ ایسی حالت میں بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ کوئی شادی کی بات کرنے..... اور میرے لیے تو یقیناً یہ ایک معیوب سی بات ہوگی...... میں تو اس ارادے کو کب کا دل سے نکال باہر کر دیا اور پھر میں نے تمہیں کئی بار بہت اچھی طرح سمجھا بجھا کر لکھا تھا کہ عادل کی شادی جلد رچا دو۔ میری راہ نہ دیکھو۔ میرا راستہ بالکل ہی الگ ہے۔ میں تو وقت کے تیز رفتار دھارے میں بہی جا رہی ہوں۔ منزل کا حصول وقت ہی بتائے گا۔ مگر تم دونوں نے میری باتوں کو مذاق سمجھا۔

آسیہ! میری خیر خواہ سہیلی! جس لڑکی کی قسمت میں شادی کی لکیر ہی نہ بنی ہو وہ بھلا کیوں کر قدرت سے بغاوت اور سرکشی کر سکتی

ہے۔ اگر میں صرف اپنی خوشی کی خاطر اپنی معصوم چھوٹی سی بہنوں کو بے سہارا چھوڑ کر دور بھٹکنے پر مجبور کر دیتی تو کیا مناسب تھا۔؟

جب دنیا ہی عارضی ہے تو دنیا کی ساری چیزیں عارضی ہیں.....
موت سے پہلے زندگی ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

تم نے لکھا تھا عادل میری تمام ذمہ داریوں کو اپنے کاندھوں پر رکھنے کا خواہاں ہے..... میرا غم بانٹ لینا چاہتا ہے یہی نا.....!

آسیہ! میری محسن دوست! میرے کندھوں کا بوجھ میرے ہی کندھوں پر اچھا اور بھلا معلوم ہوتا ہے اپنے آرام اور سکون کی خاطر اپنا سارا بوجھ دوسروں کے کندھوں پر لاد دینا کیا انصاف ہے؟ ہمارا مذہب ہماری تہذیب اور ہمارا اخلاق کیا یہی سب سکھاتا ہے؟

آسیہ! ڈیئر! عادل سے میں نے محبّت کی ہے، دل کی گہرائیوں سے، روح کی پہنائیوں سے اور پھر سچی محبّت روایت کو بحال رکھنا چاہتی ہے۔ قربانی اور ایثار کی خواستگار ہوتی ہے۔..... تم عادل کی بہن ہو، دشمن نہیں۔ اس کی اُجڑی ہوئی دنیا کو آباد کرادو، اس کی زندگی میں بہار آجائے گی۔

میرے پاس تو اب فرصت نہیں کہ میں اس قسم کی باتوں پر غور کروں۔ فرزانہ کی شادی ہونے والی ہے..... فرزانہ کا جہیز..... یعنی "صدقہ" کا انتظام ہو چکا ہے۔" صدقہ" اس لفظ کو تم ضرور دوبارہ پڑھو گی اور سوچنے پر مجبور ہو جاؤ گی کہ میں نے یہ لفظ جہیز کے لیے کیوں استعمال کیا ہے؟...
... یقیناً یہ دولہن کا صدقہ ہی تو ہے، جسے نوشہ والوں نے جہیز کا نام دے

رکھا ہے.....

اس لیے میں فرزانہ کا صدقہ خوب جی کھول کر ادا کرنا چاہتی ہوں۔ تاکہ اس کی سسرال میں اس رقم کی کمی کے باعث اُسے روحانی اذیّت کا سامنا نہ کرنا پڑے.....!

آسیہ! تمہارے کہنے کے مطابق ہی میں تمہارے ایک ایک سوال کا جواب دینے کی کوشش کر رہی ہوں۔... اب پھر تم نے شادی کا تذکرہ چھیڑا..... اللہ توبہ!..... تم پھر یہ کیا مذاق لیے بیٹھی ہو.....
عادل کی بات اور ہے..... وہ مرد ہے اور مرد کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ عادل کو تو میں نے ابھی کچھ ہی دن پہلے اپنے کالج کے اسٹاف روم میں ایک پروفیسر صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا..... وہ تو بالکل ہی نہیں بدلا۔ وہی متناسب جسم، وہی حسین وضع قطع، وہی انداز، وہی چال، وہی سب کچھ، وہ تو بالکل ویسے ہی لگ رہا تھا جیسے وہ پہلے تھا۔ اس میں کچھ بھی تغیّر و تبدّل پیدا نہیں ہوا تھا۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ میری نیک تمنّائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔

تمہاری: نفیسہ

اتنا طویل خط لکھنے کے بعد نفیسہ کو روحانی سکون کا بھرپور احساس ہوا۔

رات کافی بیت چلی تھی۔ لیکن نفیسہ کی تھکی تھکی نگاہوں میں نیند بالکل نہ تھی۔ اس کا ذہن شاید کسی سوچ میں گم تھا۔ وہ بہت زیادہ کمزور اور بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ برسوں سے کالج میں پروفیسری کرتے

کرتے بیزار سی ہوگئی تھی۔ فکر اور پریشانی کے باعث اعصاب بہت کمزور اور اس کا رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ باوجود اس کے اب بھی ایسے نقوش اس سارے وجود میں نمایاں تھے جو اس کے حسین ہونے کی صحیح ترجمانی کر رہے تھے

اس کی بے نور اور تھکی تھکی آنکھیں اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگیں.... ایک طرف رکھے ہوئے ایک پلنگ پر جا کر اس کی تھکی تھکی سی نگاہ رک گئی۔ ف... فرزانہ بالکل بے فکری کے عالم میں نیند کے آغوش میں پناہ گزیں تھی وہ اسے دیکھتی ہی رہی بہت حسرت سے.... پیار سے.... اور پھر وہ مسکرا اٹھی..... اس کی روح مسکرا اٹھی...... آج ہی وہ اپنی تمام رقم اور جی۔ پی۔ ایف (G.P.F) نکال کر لے آئی تھی۔ فرزانہ کا صدقہ ادا کرنے کے لیے۔ یہ خیال آتے ہی وہ ایک شگفتہ کلی کی طرح کھل اٹھی۔ پھر معلوم نہیں کب وہ نیند کی حسین آغوش میں کھو گئی۔

کچھ دنوں کے بعد آسیہ اور عادل نفیسہ کے مکان پر آ پہنچے انھیں نفیسہ کے خط نے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جب انھوں نے گھر کی سجاوٹ کو دیکھا تو بے حد مسرور ہو اٹھے۔ سارا گھر خوشیوں میں نہایا ہوا تھا۔ در و دیوار برقی بتیوں اور قوس قزح کے رنگوں والے کاغذات سے سجے دلہن کی طرح لگ رہے تھے۔ یہ سجاوٹ، یہ خوشیاں، یہ جگمگاہٹ یہ سب کچھ دیکھ کر آسیہ اور عادل پھولے نہیں سما رہے تھے۔ اسے اپنی بچھڑی ہوئی سہیلی مدت کے بعد مل رہی تھی جو اس کی بھابی بننے والی تھی۔ اور عادل کی خوشی تو اس روح کی پنہائیوں میں سما چکی تھی۔ وہ بظاہر سنجیدہ تھا مگر اندرونی کیفیت اس کی مسرتوں میں رنگی ہوئی تھی۔

آسیہ بے قراری کے عالم میں گھر کے اندر قدم رکھتے ہی نفیسہ کو پکارنے لگی۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ اسے اِدھر اُدھر کمرے میں تلاش کرنے میں مصروف ہو گئی۔ شادی کا گھر بالکل خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ کوئی بھی مہمان نظر نہیں آرہا تھا۔

آسیہ اپنے پراگندہ ذہن سے الجھ رہی تھی۔ شاید فرزانہ وداع ہو چکی ہے اور سارے مہمان جا چکے ہیں۔ تب ہی تو سارا گھر خاموش پڑا ہوا سسک رہا ہے۔ شاید نفیسہ نے ہمیں مصروفیات اور پریشانی کے عالم میں غلطی سے غلط تاریخ لکھ دی۔ ورنہ ہم بھی نکاح میں شریک ہو سکتے تھے ..... وہ انہی خیالات میں الجھی ہوئی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی کہ اچانک مسرّت سے اچھل پڑی اور بے اختیار چلّا اٹھی ..... عادل بھائی ..... عادل بھائی! آپ کہاں ہیں۔ ذرا اِدھر تو آیئے .. دیکھئے نا نفیسہ سج دھج کر دلہن کے لال زرّین جوڑے میں کیسی شانِ بے نیازی سے آرام کرسی پر دراز آنکھیں بند کئے ہوئے آرام فرما رہی ہیں۔ شاید فرزانہ کو وداع کرنے کے بعد جدائی کے غم سے نڈھال ہو کر سو گئی ہیں۔ دیکھئے نا ..... عادل بھائی، نفیسہ آج کتنی حسین لگ رہی ہے

عادل نے برسوں پہلے نفیسہ کو دیکھا تھا۔ امریکہ سے آنے کے بعد بھی اس نے کئی بار نفیسہ سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ مگر نفیسہ نے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ اندر ہی اندر نفیسہ کی یادیں جلتا رہا، تڑپتا رہا ....

اب وہ اُسے بہت ہی قریب سے دیکھ کر کھل گیا۔ وہ نفیسہ کو دیکھتا رہا ..... دیکھتا رہا۔ اُسے ایسے محسوس ہوا، جیسے نفیسہ کا واماندہ چہرہ اُسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ وہ پاگل ہو اٹھا۔ عالمِ بے خودی میں وہ اس

کے قریب گیا۔ بالکل قریب۔ اور آہستہ آہستہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں
سے اُسے جگانے کی کوشش کرنے لگا..... مگر.....! وہ ایک دم کانپ
گیا اور ایک دل ہلا دینے والی چیخ کے ساتھ دوسری طرف لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ....ادھر
آسیہ پتھر کا بُت بنی ہوئی اپنے جذبات کو قابو میں کر رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی
تھی کہ اس کے اندر صبر کا کتنا مادّہ پوشیدہ ہے۔ وہ یوں ہی کھڑی کھڑی
نفیسہ کے کرسی سے ڈھلے ہوئے جسم کو حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی
اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئی.... اس کے کانوں میں
یہ آواز بار بار ٹکرا رہی تھی ..... آسیہ! تم مجھے دولہن کے روپ میں دیکھنا
چاہتی ہو نا..! تم مجھے ضرور لال زرّین عروسی جوڑے میں دیکھو گی۔ اور بہت
جلد۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔ اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہاری نفیسہ
وعدہ کی پکّی اور بات کی سچّی ہے۔

آسیہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی سہیلی اپنی بہنوں
کے لیے اتنا بڑا صدقہ دے گی ___! ●●

۷ رمئی ۱۹۸۰ء

مدراس

محترم شیام سندر شرما صاحب!
ایڈیٹر "بالیکا سماچار"
نئی دہلی۔

خلوصِ بیکراں!

خط پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ آپ نے بہت ہی مختصر افسانہ انعامی مقابلہ کے لیے طلب کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں چھوٹا افسانہ کیسے لکھوں۔! آپ جانتے ہی ہیں میرے افسانے اور خط کچھ حد تک طویل ہی ہوا کرتے ہیں مختصر لکھنے کا خیال کرکے قلم اٹھاتی ہوں۔ مگر لکھتے لکھتے یہ بھول جاتی ہوں کہ میں نے مختصر کہانی یا خط کا ارادہ کیا تھا۔ بس خیالات کے تسلسل میں بہہ جاتی ہوں اور میری تحریریں خلافِ توقع طوالت اختیار کر لیتی ہیں۔ کیا کروں اب تو ایک عادت سی ہوگئی ہے اور اب یہی میری طبیعت کی افتاد کا خاصہ بن گئی ہے۔ بغاوت کرنے سے ڈرتی ہوں۔ اگر مزاج بگڑ گیا یا ادبی ذوق کے تیور بدل گئے تو پھر جو کچھ بھی لکھتی ہوں اس سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

بہرکیف! آپ کی ہدایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے بہت ہی مختصر سا افسانہ "سسکتی دلہن" کی تخلیق کی ہے۔ بس آپ یہ

سمجھ لیں کہ اتنا چھوٹا سا افسانہ لکھنے کے لیے مجھے اپنے ادبی مزاج کے ساتھ کتنا الجھنا پڑا ہوگا۔ کتنا اسے سمجھانا اور منانا پڑا ہوگا کہ وہ مان گیا۔ اس سے مجھے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ انسان حالات کے گھیرے میں آ کر بہت کچھ سیکھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدرت کی طرف سے انسان کے لیے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں تاکہ انسان زندگی کے اصل مقصد کو سمجھ سکے۔

افسانے کا عنوان "سسکتی دلہن" دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ دلہن ہندوستان کی کوئی مظلوم دلہن ہی ہوگی، جو سسرال والوں کو یا پھر اپنے ہی شوہر کی بے جا زیادتیوں اور ظلموں کی وجہ سے سسک پڑی ہے۔

دنیا بدل گئی ہے، زمانہ بدل گیا ہے، حالات بدل گئے ہیں مگر سسرال والوں کے چال چلن، نیت، خیالات اور ان کی اپنی روش نہیں بدلی۔ معلوم نہیں یہ سسرال والے بہوؤں کو اپنی بیٹیوں کی طرح کیوں نہیں چاہتے! کیوں نہیں پیار دیتے! یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُن کی بیٹیاں بھی ایک دن اپنی سسرال کا منہ دیکھیں گی۔ پھر بھی وہ سماج میں اپنی کم ظرفی اور کم فہمی کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنی جاہلیت اور بداخلاقی کا ڈھنڈورا پٹوا کر خود اپنے ہی سر کی پگڑی اچھالتے ہیں۔!

آج حالاتِ حاضرہ کے رنگ ڈھنگ سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ یہاں انسان نہیں بلکہ حیوان نما انسان بستے ہیں۔ جو اپنی حیوانیت کی بناء پر ساری دنیا پر قیامت ڈھا رہے ہیں۔ نیست و نابود کر رہے ہیں۔ نسلِ انسانی کا خون کر رہے ہیں۔ ایسے خطرناک اور انسانیت

سوز مخلوق کا خاتمہ یقیناً ضروری ہے۔ نہیں تو دنیا میں اس طرح سے ابنائے
انتہا چار اور ظلم و ستم کا بازار گرم ہوتا ہی رہے گا۔

جب ماضی کی طرف دھیان جاتا ہے تو دل و دماغ کو ایک
طرح کی راحت نصیب ہوتی ہے، اس لیے کہ ماضی کے انسان پھر بھی
انسان ہی تھے۔ مگر حال میں تو کوئی بھی انسان نظر نہیں آرہا ہے اور
مستقبل کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ وہ درندوں، وحشیوں
اور بھیڑیوں کی دنیا کہلائے۔ کیا ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟

بہر طور! اس افسانے میں "سسکتی دلہن" کا جو اندازہ
ہے یہ دلہن وہ دلہن نہیں ہے مگر پھر بھی یہ ایک دلہن ہی ہے۔
آپ پڑھ لیں اور فیصلہ کریں کہ کیا اس دلہن کی سسک کا کوئی مول
ہے؟ کوئی قیمت ہے؟ کوئی لحاظ ہے؟ کیا اُسے اپنا حق مل جائے گا؟..
... یا نہیں... ! یہ میں آپ کے فیصلے پر چھوڑتی ہوں کہ کہاں تک آپ
اس سسکتی دلہن کے ساتھ انصاف کرتے ہیں ___!

خیر اندیش

[signature]

سِسکتی دُلہن

اتنی رات گئے اس سنسان اجڑی سی بستی کی اس فرسودہ جھونپڑی میں کون کراہ اور سسک رہا ہے۔

ملک کے حاکمِ اعلیٰ نے اپنے پرائیوٹ سیکٹری سے تحیّر آمیز لہجے میں دریافت کیا، جو کسی سیاسی محفل سے تقریر کے بعد لوٹ رہے تھے۔

جنابِ عالی! .... ہر رات یہاں سے اسی قسم کی رونے اور کراہنے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ بڑا درد اور سوز ہے اس آواز میں حضور!

تمہیں کس نے بتایا کہ ہر روز یہ آواز یہاں سے آتی ہے۔

حضور! ..... دیش کا بچّہ بچّہ اس کی بے چارگی سے واقف ہے۔

اچھا ــــ! مگر یہ عورتیں ہیں کون؟

جناب ــــ! ایک سہاگن ہے جو اپنی ماں سے جُدا ہونا نہیں چاہتی اور جو بھری جوانی میں اپنی مانگ کی لالی بچانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہے۔ چاروں طرف مخالفت کا پُر زور حملہ ہے۔ کم زور ناچار اس سُہاگن کا کوئی مہربان نہیں، کوئی ہمدرد نہیں ــــ

کیا اس کی ماں کے علاوہ دوسرا اور کوئی نہیں؟

ہے کیوں نہیں حضور! .... ویسے تو سب ہی ہیں۔ مگر سب کے سب سبز باغ دکھا کر وعدے سے مکر جاتے ہیں۔ اور پھر

بے چاری اپنی بے چارگی کا ماتم اپنی ماں کے ساتھ مل کر کرتی رہتی ہے۔

آواز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ بے چاری بہت دکھی ہے۔ . . .

سیکرٹری! تم نے نام تو اب تک نہیں بتایا...... آخر یہ سہاگن ہے کون؟ شاید میں اس کی کچھ مدد کر سکوں —!

جنابِ عالی!.... اس سہاگن کا نام ہے اردو....

....اور اس کی ماں کا نام ہے ہندی —! ●●

۵/ مارچ ۱۹۸۲ء

مدراس

معزز انیس دہلوی بھائی صاحب!

آداب و خلوص!

گزشتہ ماہ دو خطوط آپ کے نام تحریر کر چکی ہوں۔ مگر آپ کی
طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو میں نے یہی سمجھا کہ آپ پھر کسی بیرونی ملک
کے سفر پر چلے گئے ہوں گے۔ مگر ابھی ابھی کچھ دیر پہلے آپ کا مراسلہ نظر نواز
ہوا۔ "فلمی ستارے" بھی موصول ہوا۔ خط پڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ اس
شمارے میں آپ کے سفرنامے کی پہلی قسط شائع ہوی ہے۔ میں نے خط
پڑھنے کے فوراً بعد "فلمی ستارے" کو اٹھایا۔ میری انگلیاں جلدی جلدی
صفحات پلٹنے لگی اور نظریں سفرنامہ کی کھوج میں اِدھر سے اُدھر بھٹکنے لگیں۔
اچانک صفحہ ۵۲ پر میری نظریں ٹھہر گئیں۔ جس پر آپ کا سفرنامہ
"لندن کے شب و روز" درج تھا۔ بس کیا تھا! میں نے پڑھنا شروع کیا
بہت اچھا لکھا ہے آپ نے۔ آپ کی یادداشت کا جواب نہیں۔ منٹ
منٹ کی باتیں، مناظر اور مقامات کو آپ نے اپنے ذہن میں اس طرح
بسالیا کہ پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جو منظر کشی کی ہے، جو حالات

بیان کئے ہیں، جو نقشے کھینچے ہیں ان سب کو اب اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں اور متاثر ہو کر انھیں اپنے نوکِ قلم کی زد میں لا رہے ہیں۔!

لندن کا ایر پورٹ ہیتھرو کا ذکر آپ نے جیسا کیا ہے میں نے بھی اسے بالکل ویسا ہی پایا تھا۔ ۔ ۔ ۔ جب ہم ۱۹۸۱ء میں امریکہ کے سفر پر گئے تھے۔ واپسی پر لندن سے جدّہ بھی گئے تھے۔ وہاں سے حرمینِ شریفین کی دوسری بار خدا کے فضل و کرم سے زیارت کی تھی۔ اس کے بعد پھر لندن واپس آئے۔ اور پھر وہاں سے پیرس اور سوئٹزر لینڈ ہوتے ہوئے بمبئی اور پھر مدراس پہنچے ۔ ۔ ۔ ۔! آپ کی تحریر پڑھنے کے بعد میری یادداشت کی ڈائری سے ایک ایک ورق اپنے آپ کھلنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔! مبارک باد قبول فرمائیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلا خط تو میں نے پڑھ لیا ہے اب اپریل کے شمارے میں نازیہ حسن کا انٹرویو پڑھوں گی ـــــ!

آیندہ ماہ دلّی آنے کا پروگرام بنا رہی ہوں۔ اگر آپ دلّی سے باہر کسی دوسرے شہر جا رہے ہیں تو مطلع کریں۔ کیوں کہ اگلے ماہ میرا دلّی آنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اب آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں پھر دروغ گوئی سے کام لے رہی ہوں۔ پچھلی بار دو مرتبہ کے پروگرام اس لیے کینسل ہو گئے تھے کہ اچانک پورٹ بلیر اور امریکہ سے میرے خاص رشتہ دار آ گئے تھے۔ مگر اب جو پروگرام ہے قطعی ہے۔ اس لیے کہ میں دو خاص کاموں کے تحت یہ سفر کرنا چاہتی ہوں۔ ۱ ۔ ۔ ۔ ۔ اول یہ کہ مجھے شر یمتی اندرا گاندھی سے ملاقات کرنی ہے، وہ میری بے حد پسندیدہ شخصیت ہیں۔ ملاقات کا مقصد یہ ہے کہ پورٹ بلیر (انڈمان) جو سیلیولر جیل ہے جسے انگریزوں

نے قیدیوں کے ذریعہ ۱۸۹۷ء میں شروع کیا تھا اور ۱۹۰۶ء میں یعنی ۹ سال کی مدّت کے بعد مکمل کیا۔ آج وہ (National Monument) ہے۔ اس پر میں ایک فلم بنانے کی خواہش مند ہوں۔ اسکرپٹ وغیرہ سب تیار ہے۔ بس اس سلسلے میں ان سے گفتگو کرنی ہے۔..... دوئم! میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ اب اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کردوں۔ یہ میرا مصمم ارادہ ہے، جس کا ذکر میں آپ سے بہت پہلے کر چکی ہوں.....!

میرے بہت سارے افسانے ضائع ہو چکے ہیں۔..... کچھ ڈاک کی نذر ہو گئے اور کچھ میرے مہربان دوست واحباب کی بے پناہ محبت و چاہت کی وجہ سے پنساریوں کی دکانوں کے لفافے بن چکے۔ مگر پھر بھی جو رہ گئے ہیں وہ فی الحال دو مجموعوں کے لیے کافی ہیں۔

بہر طور.....! ملاقات پر اس سلسلہ میں مزید باتیں ہونگی ایک افسانہ "تیسرے دن" ارسالِ خدمت ہے۔ امید ہے آپ اسے کسی قریبی اشاعت میں شائع کردیں گے.....!

زمانہ کی برق رفتاری کا آج یہ عالم ہے کہ ہر چیز کی انتہا نظر آتی ہے..... شادی بیاہ کے بارے میں بھی آج کا دور یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پھر بھی ان کی شادی نئے انداز اور نئے طریقے سے اس طرح کردی جاتی ہے کہ ان میں سے ایک ہندوستان میں ہوتا ہے تو دوسرا امریکہ یا یورپ میں بس فون کے ذریعہ نکاح کی رسم ادا کردی جاتی ہے۔ پھر دُنیا لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے کے شریکِ حیات تسلیم کرلیتی ہے۔..... نئے زمانے

کا یہ ارتقاء آج کل ہمارے ہندوستان کی فضا پر پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہے...... اچھا ہے! مگر کبھی کبھی جان لیوا بھی ثابت ہو سکتا ہے...!

اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔

آپ کی بہن

صبا صدیقی!

تیسرے دن

وہ بہت دیر تک اُسے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ آخر کار وہ بیزار ہو کر بول اٹھی:

"یہ کیا بدتمیزی ہے ایک شریف لڑکی کو اس طرح گھور رہے ہیں آپ؟"

یہ سنتے ہی وہ چونک پڑا جیسے خواب سے بیدار ہوا ہو۔

"اوہو! معاف کیجیے گا... ! میں آپ کو نہیں، بلکہ آپ میں کچھ اور دیکھ رہا تھا۔"

وہ اس کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے برس پڑی:
"کچھ اور دیکھ رہا تھا... ! کیا دیکھ رہے تھے؟ شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ تم مسلسل میری ہی طرف دیکھ رہے تھے اور بڑے معصوم بن کر کہتے ہو کہ میں کچھ اور دیکھ رہا تھا۔ کچھ اور، کہیں اور جا کر دیکھیے۔ بہت سارے حسین دل کش اور روح پرور نظارے ہیں قدرت کے، دلفریب اثر انگیز جلوے ہیں... یہ سامنے خوب صورت بہتی ہوئی صاف و شفاف ندیاں ہیں۔ وہ دور بڑی بڑی مستحکم لمبی چوڑی گھاٹیاں ہیں۔ وہ دیکھو اُدھر کتنی خوب صورت جھیل اپنے دامن میں خاموش لیکن گہرا پانی لیے ہوئے

کیسی شاداب نظر آرہی ہے۔ اور ہاں! وہ دیکھو: اس کے قریب ہی کتنے حسین اور دل کش، فیاض فوارے کتنے لطیف نظر آرہے ہیں۔ جن کے دامن سفید چمک دار موتیوں کے خزانے لیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی سخاوت تو دیکھیے کہ دوسروں کی خوشنودی کے لیے اپنے دامن کو داغ دار کر کے ان موتیوں کو دوسروں پر نچھاور کر رہے ہیں۔

اور یہ دیکھیے اوپر سفید قالینوں پر جُدا جُدا قوس و قزح کی طرح رنگ برنگے گلاب کتنے دل کش انداز میں جھوم رہے ہیں اور سرد ہواؤں کے جھونکے کس کس انداز سے انھیں گلے ملنا سکھا رہے ہیں۔

اور ہاں..... ذرا اپنا سر اوپر تو اٹھائیے، وہ دیکھیے..... اوپر لامحدود کیسا کشادہ.... و وسیع نیلا آسمان ہے..... ذرا اپنا غرور کا سراب نیچے جھکائیے۔ یہ دیکھیے سرسبز زمین ہے جہاں آپ کھڑے ہیں۔ ان تمام قدرتی مناظر کو دیکھیے اور دیکھتے ہی رہیے —! سمجھے۔"

وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے جانے لگی۔

وہ لڑکا اس کے اس طرح جذباتی لیکن غصّے سے بھرپور شاعرانہ اندازِ بیان پر دل و جان سے اور فدا ہو گیا۔ اس لڑکی کو جاتے ہوئے دیکھ کر وہ بے قرار ہو اٹھا اور اُسے روکنے کی خاطر کہنے لگا۔

"معاف کیجیے گا محترمہ شاعرہ صاحبہ! ان حسین قدرتی مناظر جن کی ابھی ابھی آپ نے ایک ایک کر کے بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں وضاحت کی ہے، میں ان ہی حسین نظاروں کو تو دیکھ رہا تھا.....

آپ ایک شاعرہ ہوتے ہوئے بھی یہ نہ سمجھ سکیں۔ تعجب ہو رہا

ہو رہا ہے۔ دیکھیے اب میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔

قدرت نے حسن کا ایک مرکز مرتب کر دیا ہے اور دنیا میں پھیلے ہوئے اس تمام حسن کو اس ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا ہے۔ محترمہ! میں خدا پرست ہوں اور اپنے خدا سے کیسے بغاوت کر سکتا ہوں! اس لیے میں آس پاس، اِدھر اُدھر، اوپر نیچے کو نہ دیکھ کر حسن کے اس مرکز کو دیکھنے کا قائل ہوں جہاں حسن سمٹ کر جمع ہو گیا ہے..... آپ نے میرے تسلسل کو توڑ دیا میری عبادت کو درہم برہم کر دیا۔ شاید آپ نے میرے ساتھ یہ اچھا سلوک نہیں کیا ......"

یہ کہتے ہوئے شدّتِ جذبات سے وہ بے قرار ہو گیا۔ وہ لڑکی اس طرح اس کے اظہارِ جذبات پر اور برہم ہو گئی۔

"بدتمیز کہیں کے ۔۔! آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"محترمہ....!" وہ پھر جذباتی انداز میں گویا ہوا۔ "میں نہ بدتمیز ہوں اور نہ کوئی آوارہ یا لفنگا ہوں، میں ایک شریف انسان ہوں۔ میری شرافت کی یہی ایک دلیل کیا کم ہے کہ میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ بھلا میرا اس سے زیادہ اور کیا قصور رہے...؟

ابھی کچھ دیر قبل آپ نے بھی تو چاروں طرف بکھرے ہوئے ان قدرتی مناظر کی بڑے اثر انگیز انداز میں وضاحت فرمائی تھی۔ میں بھی ان ہی حسین مناظر کا دیدار کر رہا تھا اور آپ ہیں کہ بُرا مان گئیں۔

بھلا میری یہ جرأت کہ میں آپ کو دیکھوں۔ ہاں! آپ کے اس خوب صورت چہرے پر میں قدرت کے ایک جاذب نظر کرشمہ کو دیکھ رہا تھا

جو دلہن کی طرح خوب صورت زرق برق لباس میں ملبوس گھونگھٹ کاڑھے حُسن وجمال کا مکمل شاہ کار ہے۔ اگر سچ بات کہنا جرم ہے تو آپ کو پُورا حق حاصل ہے کہ آپ مجھے جو چاہے سزا دیں۔"

وہ اس لڑکی کے سامنے اپنا سر نیاز خم کرتے ہوئے بڑی نیاز مندی کا مظاہرہ کرنے لگا۔

"اُف میرے خدا..... تم کتنے ڈھیٹ اور نڈر ہو۔"

اس لڑکی کا سراپا غصّے میں تھر تھرانے لگا اور وہ وہاں سے چلی آئی اور خود سے بڑبڑانے لگی..

"اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ ڈیڈی سے سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔"

دوسرے دن بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔

بہار کا موسم نینی تال کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ ملک و بیرونِ ملک سے آئے ہوئے لوگوں کا ہجوم، لباس میں طرح طرح کے رنگوں کی حسین آمیزش، عورت، مرد، بچّے، بوڑھے سب کا اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنا اور حسین مناظر سے لطف اندوز ہونا۔ کالج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا آپس میں ہنسی مذاق کرتا ہوا جدا جدا غول فضا کو کچھ اور رونق افزا اور جاندار بنا رہا تھا۔ اسی خوش گوار اور سازگار فضا میں وہ جہاں کہیں بھی جاتی اپنا دل بہلاتی، خوشیوں سے ہمکنار ہوتی، رقص کرتی، گاتی وہ لڑکا سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتا ہوا وہاں پہنچ جاتا۔ اس کی سحر انگیز نگاہوں میں فوراً شعلے نمودار ہو جاتے۔ وہ اس سے بالکل عاجز آچکی

تھی۔

آخر کار اس نے اپنے ڈیڈی سے سب کچھ کہہ دیا اور بتایا کہ اب ہم یہاں ایک پل بھی نہیں گزاریں گے اور واپس دہلی چلے جائیں گے۔"....

اس کے والد نے اس آوارہ مزاج لڑکے کو دیکھنے اور سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔

تیسرے دن ...... نینی تال کے گیسٹ ہاوز کے ڈائننگ ٹیبل کے قریب کرسی پر بیٹھا چائے پیتا ہوا وہ لڑکا اُسے نظر آگیا ...... لڑکی نے اپنے ڈیڈی سے کہا:

"وہ دیکھئے ڈیڈی ..... ادھر دائیں طرف ڈائننگ ٹیبل پر سفید ڈریس پہنے ہوئے وہ چائے پی رہا ہے۔ وہ وہی آوارہ مزاج لڑکا ہے، جس نے مجھے بے حد پریشان کررکھا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں تمہاری صورت میں قدرت کی حسین کرشمہ سازی دیکھ رہا ہوں، جو دلہن کے لباس میں گھونگھٹ لٹکائے ایک شاہ کار لگتی ہے۔"

"اچھا! اس نالائق اور بدتمیز کی یہ ہمت! میں ابھی اس کے پاس جاتا ہوں اور فون کرکے اُسے پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔"

اس لڑکی کے ڈیڈی دھیرے دھیرے اس کے قریب جا پہنچے اور اسے غور سے دیکھنے لگے۔

"اوہو.... ! اچھا!! تو آپ ہیں وہ آوارہ، بدمعاش بدتمیز!"

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ــــ

"ارے انکل آپ....؟ تشریف رکھیئے - چائے نوش فرمائیے"
اس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

"نہیں نہیں - ہم ابھی کمرے سے چائے پی کر ہی نکلے ہیں۔"
ان دونوں کو مصروف گفتگو دیکھ کر وہ لڑکی بھی ان دونوں کے قریب جا پہنچی اور غصّے سے بپھر پڑی........

"ڈیڈی......!؟ یہ کیا.....؟؟ آپ تو اس بدمعاش کو پولیس کے حوالے کرنے آئے تھے، اب اس سے خوش اخلاقی اور سنجیدگی سے پیش آ رہے ہیں...!"

"ہاں ہاں، بیٹی! انھیں اب پولیس کے حوالے کرنا ہی پڑے گا ورنہ یہ باز نہیں آئیں گے۔ ایسا کرو - وہ دیکھو سامنے فون رکھا ہوا ہے - تم نینی تال پولیس کو فون کرو - جب تک میں یہاں ان کے ساتھ رہتا ہوں، ورنہ یہ کہیں فرار ہو جائیں گے......

وہ ایک پل کے لیے اُسے نفرت سے دیکھتی رہی اور پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائیل کرنے لگی۔ اتنے میں اس کے ڈیڈی بول اٹھے۔

"لیکن......! زیبا بیٹی! ذرا سوچ سمجھ کر پولیس کو مطلع کرنا۔ یہ آوارہ، بدتمیز لڑکا بھی نہایت ہوشیار اور خطرناک ہے۔ ان کا نام عندلیب ہے اور یہ امریکہ سے برسوں آئے ہیں۔"

زیبا چونک پڑی اور سراپا حیرت بن گئی...... وہ دل ہی دل میں کہنے لگی۔

"عندلیب! کیا یہ وہی عندلیب ہیں جن سے میرا عقد دہلی سے

امریکہ بذریعہ فون ایک ہفتہ قبل ہوا تھا ؟ دو ماہ بعد میں ڈیڈی کے ساتھ امریکہ اُن کے پاس جانے والی تھی۔ ان کا تو کوئی پروگرام ہندوستان آنے کا نہیں تھا ..... پھر..... ؟؟"

وہ حیرت زدہ کچھ دیر تک عندلیب کو دیکھتی رہی۔ پھر اُسے اس کی شرارتوں کے جواز کا اندازہ ہوا کہ وہ کیوں اس کے پیچھے سایہ کی طرح لگا رہتا تھا۔

وہ کیوں اُسے قدرت کا ایک حسین شاہ کار لگ رہی تھی۔ کیوں عندلیب کو وہ دلہن کی طرح زرق برق لباس میں قدرت کا ایک بے مثل نمونہ لگ رہی تھی۔

وہ اسی طرح کچھ دیر سوچتی رہی ...... پھر اس نے دھیرے سے ریسیور کو کریڈل پر رکھا اور لجاتی شرماتی ڈائننگ ہال سے بھاگ نکلی۔ ••

۱۷ر جون ۱۹۸۲ء

مدراس

مکرمی انیس بھائی صاحب !

خلوصِ فراواں ۔

ہر شمارے میں "لندن کے شب و روز" پڑھنا نہیں بھولتی ہوں ۔ آج چوتھی قسط میں نے پڑھ لی ہے ۔ پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں بھی اس سفر میں موجود ہوں ۔ اور خوش گوار فضا اور سازگار ماحول سے لطف اندوز ہو رہی ہوں ۔ اب آگے کے حالات جاننے کے لئے ہر شمارے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے ۔

بڑے ابو فلمی رسالے بہت ہی کم اپنے مطالعہ میں رکھتے ہیں ۔ مگر آج کل اُن کے ہاتھوں میں "فلمی ستارے" دیکھے جا رہے ہیں ۔ ایک دن میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ فلمی ستاروں کو کب سے پڑھنے لگے ۔ انھوں نے جواب دیا ۔ "میں فلمی ستاروں کو نہیں بلکہ "فلمی ستارے" کے ایڈیٹر جناب انیس صاحب کو پڑھ رہا ہوں ۔" اب آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کا سفرنامہ کتنا پسند کیا جا رہا ہے ــــــ !

آپ کے گزشتہ خط سے معلوم ہوا کہ میرے دونوں افسانے ابھی

تک آپ کو نہیں ملے ۔ تشویش لاحق ہو رہی ہے ۔ معلوم نہیں کیوں ڈاک کی بدانتظامی اب دن بدن بڑھتی ہی جا رہی ہے ...... پہلے بھی میرے اس طرح کے کئی افسانے گم ہو چکے ہیں ۔ مگر ان افسانوں کے کھو جانے پر مجھے اتنا افسوس اور دکھ نہیں ہوا ، جتنا غم اور پریشانی ان دو افسانوں کے ضائع ہونے پر ہو رہی ہے ۔ اس لیے کہ ان کی نقلیں میرے پاس نہیں ہیں

یہ حقیقت یہاں واضح ہو گئی کہ مصیبت جب آتی ہے تو ہر طرف سے آتی ہے ۔ ۔ ۔ ..... ہوا یوں کہ آپ کے نام افسانوں کا بڑا سا لفافہ میں لڑکے کو پوسٹ کرنے کو دے دیا ۔ وہ لفافہ لے کر چلا گیا ۔ اس کے بعد میں نے سکون کی سانس لی ۔ کیوں کہ تقریباً ایک ہفتہ سے میں نے اپنے شب و روز ان دونوں افسانوں کو مکمل کرنے میں صرف کر دیئے تھے ۔ میں مطمئن ہو کر چائے کے گرم گرم گھونٹ لینے لگی تاکہ تکان کچھ حد تک دُور ہو جائے ۔ .... سامنے ٹیبل پہ دونوں افسانوں کی نقلیں پڑی ہوئی تھیں ۔ چائے کے کش لیتے لیتے غیر ارادی طور پہ جب میری نظریں ان افسانوں کی نقلوں پر پڑ جاتی تھیں تو مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا تھا ۔ یہ سوچ کر کہ یہ دونوں افسانے بڑی حد تک دیگر افسانوں سے ہٹ کر اپنی انفرادیت کے الگ الگ مالک ہیں ۔ جب شائع ہوں گے تو قارئین بہت پسند کریں گے ۔

بھائی صاحب ! انسان جب اپنی فتح پر بے حد خوش اور نازاں ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنے اطراف کے ماحول سے بالکل ہی بے نیاز ہو جاتا ہے اسے یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ اس کی کچھ دیر کی خوشی اور بے نیازی اس کے لیے تباہی اور بربادی کا سامان مہیّا کر سکتی ہے ...... میں کبھی اپنی

کہانیوں کے مکمل ہونے پر نازاں تھی، خوش تھی اور بہت مطمئن تھی۔
ان ہی ملے جلے احساسات کی وجہ سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے مجھ سے
لغزش ہوگئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ساری کی ساری چائے افسانوں
پر پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر میرے ہوش گم ہوگئے۔ میری کچھ دیر کی خوشی مایوسی
اور اداسی میں تبدیل ہوگئی۔..... کیوں کہ افسانے میں نے بال پن سے
نہیں بلکہ روشنائی سے لکھے تھے۔ لہٰذا گرم گرم چائے کے گرتے ہی تحریریں
گرمی سے متاثر ہوکر آپس میں گھلنے اور ملنے لگیں۔ یہ منظر میں بڑی مجبوری
اور بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ لفظوں کا صاف و شفاف وجود آہستہ
آہستہ پھیکا پڑنے لگا اور اس کی جگہ اوراق کے دامنوں پر دھبوں کا بدنما
عکس نمایاں ہونے لگا۔ یہ دیکھ کر مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی اوراق
ہیں جن پر ابھی ابھی کچھ دیر پہلے میرے افسانوں کے کردار زندگی بن کر
بول رہے تھے۔ اتنی جلدی یہ ساری زندگیاں ذراسی لاپرواہی کی بناء پر تباہ
وبرباد ہو جائیں گی۔! مٹ جائیں گی !..... فنا ہو جائیں گی .....! مجھے
خواب وخیال میں بھی اس کا گمان تک نہیں تھا....!

بھائی صاحب! یقین جانئے میری روح کانپ گئی۔ میری سوچ
تھم گئی۔ اور میرا مجسّم وجود ڈھیلا پڑھنے لگا۔ چوں کہ ان دونوں افسانوں میں
غربت میں پلنے والے پانچ الگ الگ خاندانوں کی پچیس ۲۵ زندگیوں کی حقیقتیں
تڑپ رہی تھیں، کراہ رہی تھیں۔ اب میں کیسے ان خون کے آنسو روتی ہوئی
بے نقاب انسانی سچّائیوں کو پھر سے بالکل ویسے ہی لفظوں کے پیراہن کا روپ
دے کر انھیں نئی زندگی عطا کروں.....! پہلی بار جو تخلیق تحریر کی جاتی ہے

اس میں ڈھانچہ کے ساتھ روح بھی پیوست ہوتی ہے۔ مگر دوسری بار اگر
اسی پلاٹ پر قلم اٹھایا جائے تو اس میں نہ تو وہ بات پیدا ہو سکتی ہے جو
پہلی کوشش میں ہوتی ہے۔ اور نہ ہی وہ پہلا سا اثر و روانی ....
بس یہی احساس مجھے دکھی بنائے جا رہا ہے۔ پہلے تو یہ عالم تھا کہ ایسے حالات
پر رو دیا کرتی تھی۔ مگر اب یہ حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی ہے کہ رونے دھونے
سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کھوئی ہوئی چیزیں واپس نہیں آجاتیں ....
برعکس اس کے مزاج بگڑ جاتا ہے۔ اور ہمت پست ہونے لگتی ہے۔ لہٰذا
میں نے رونے اور فکر کرنے کے انداز کو یکسر بھلا دیا اور صبر و استقلال
کا دامن پکڑ لیا ہے۔ صبر پہ مجھے پورا بھروسہ ہے۔ اس لیے کہ صبر کرنے والوں
کو خدا بھی پسند فرماتا ہے۔ اور صبر کا ظاہری صلہ دیر سے سہی مگر بہت
خوب صورت اور خوش گوار ہوتا ہے۔ جس نے بھی اپنے اندر صبر پیدا
کیا وہ ہر میدان میں کامیاب رہا ــــ صبر کی خاصیت یہی ہے کہ وہ
مٹی کو کندن اور کوئلہ کو ہیرا بناتی ہے ..... اب دیکھنا یہ ہے کہ میرے
صبر کا پھل مجھے کس رنگ میں ملتا ہے۔

"اور میں اُسے پیار کرنے لگی" حاضرِ خدمت ہے۔ گھر کے
ملازموں کے کردار بھی بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ
پیار و محبت کا برتاؤ کیا جائے تو سر پہ چڑھ جاتے ہیں۔ اعتدال برتا
جائے تو شکایت کرتے ہیں اور اگر انھیں ان کے مرتبے کا احساس
دلایا جائے تو بُرا مان جاتے ہیں ...! میرے اس افسانے میں ملازمہ کی
بیٹی کا کردار آپ کو متاثر کرے گا ..... مُنّی بہت معصوم پُرکشش

مگر باتونی اور چنچل ہے۔ جس کا یہاں صرف ایک ہی پہلو میں نے اُجاگر کیا ہے۔ باقی دوسرے شمارے میں تحریر کروں گی ـــ!

امید ہے آپ مع متعلقین بعافیت ہوں گے ـــ!

آپ کی بہن

صبا مصطفیٰ

اور میں اُسے پیار کرنے لگی

ایک ماہ سے میں بہت پریشان تھی ۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے میں اُسے اپنے بس میں کر دوں ۔ میری ساری تدبیریں رائیگاں ہونے لگیں میں اس مسئلہ میں گویا اپنے آپ کو مجبور سمجھنے لگی ۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں کیوں اور کس لیے ایک چھ سالہ لڑکی سے ڈرنے لگی ہوں ۔ بات ہی کچھ ایسی تھی ۔

ایک ماہ قبل یہ چھ سالہ بچّی مُنّی اپنی ماں کے ساتھ ہمارے یہاں آئی تھی ۔ ایک دن بھی نہیں گزرا تھا کہ مُنّی پورے گھر میں بڑی دلیری اور آزادی سے گھومنے پھرنے لگی ۔ خوف اور تکلّف نام کی کوئی چیز اس کے دل میں نہیں تھی ۔

رفتہ رفتہ گھر کی ہر چیز کو وہ اپنی ملکیت سمجھنے لگی ۔ کانچ کے برتنوں کو توڑنا ، کھانے کی چیزوں کو بغیر اجازت اٹھا کر کھا لینا ، شور و غل مچانا ، دوڑنا ، بھاگنا ، غرض کہ ہر قسم کی بے جا حرکتوں سے وہ گریز نہیں کرتی تھی اس کی ماں اُسے اُس کی ہر غلطی پر ٹوکتی ، سمجھاتی ، ڈانٹتی اور مارتی رہتی تھی ۔ لیکن اس پر ماں کی فہمائش اور زد و کوب کا بھی مطلق کوئی اثر نہیں ہوتا تھا ۔

شروع شروع میں منّی مجھے بہت پیاری لگتی تھی۔ اس کا معصوم سانولا گول چہرہ، چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے کالے کالے بال بڑی چمکیلی شرارت بھری آنکھیں۔ میٹھی میٹھی توتلی دکنی زبان غرض کہ میں اس کی ہر بات سے متاثر تھی۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا میری محبّت و شفقت اور بے پناہ ہمدردی کو دیکھ کر منّی مجھ سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگی۔ اس کی شرارت دن بدن بڑھنے لگی۔ میں اس کی شرارت کو دیکھ کر اُسے پیار سے سمجھانے لگی۔ لیکن میرے سمجھانے کا اس پر الٹا ہی اثر ہوا۔ اب وہ میری باتوں پر کم دھیان دینے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں اس سے ایک گونہ بیزار سی رہنے لگی۔ آہستہ آہستہ میری بے زاری نفرت کا رنگ اختیار کرنے لگی۔

یوں تو بچّے مجھے بہت اچھّے لگتے ہیں۔ ان کے چہرے سے معصومیت کا بڑا دلکش اظہار ہوتا ہے۔ ان کی شرارتوں میں ان کا معصوم حُسن نکھر کر اور دوبالا ہو جاتا ہے۔ لیکن جو بچّے حد سے زیادہ شرارت پر آمادہ رہتے ہیں اور جس کی شرارتوں میں مکمل شیطانیت کا رنگ غالب رہتا ہے اس قسم کے بچّے مجھے بالکل پسند نہیں آتے۔ یہی بات میں نے چھ سالہ مُنّی میں دیکھی تھی، یہی وجہ تھی کہ میری بڑھتی ہوئی محبت دھیرے دھیرے نفرت میں تبدیل ہونے لگی۔

اس کی طرف سے میری توجہ اب بالکل کم ہو گئی۔ کھانے وقت پیار سے قریب بُلا کر کچھ کھلانا، بازار سے اس کے لیے کھلونے، کپڑے اور مٹھائیاں

لانا یہ سب کچھ میں نے بند کر دیا۔

مُنّی کی طرف سے میرا دل بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ اب میں اسے اپنے گھر پر رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اسے رکھنا ہی پڑا۔ اس کی ماں اسے کسی اور جگہ نہیں رکھ سکتی تھی۔ لامحالہ قہرِ درویش برجانِ درویش یہ تلخ گھونٹ مجھے پینا ہی پڑے۔

لیکن پھر بھی میری یہی کوشش رہتی کہ مُنّی میرے سامنے نہ آئے تو اچّھا ہے۔ اس سے میں ایک طرح سے گھبرانے اور خوف کھانے لگی تھی۔ لیکن اکثر اس کی نظریں بچا کر میں اس کی نقل و حرکت بھی دیکھتی رہتی تھی۔

ایک دن میں کچھ لکھ رہی تھی۔ میرے سر میں شدّت کا درد شروع ہوا۔ مُنّی کی ماں سے میں نے ایک پیالی گرم چائے بنانے کو کہا اور بستر پر دراز ہو گئی۔ شاید مُنّی مجھے کہیں سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں اس وقت اس کی حرکتوں سے بالکل انجان تھی۔ اس کی ماں چائے میری مسہری کے قریب میز پر رکھ کر چلی گئی۔ میں بستر سے اٹھی اور ڈریسر سے ایک کوڈ ویرن نکالی اور گرم چائے کے ساتھ کوڈ ویرن کی سفید گولی حلق میں اتار لی اور پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اتنے میں مُنّا کسی طرف سے آئی اور کہنے لگی:

"تُم اب کائیکو سوتئیں سو۔ تمنا بخار ہے کیا؟ تمہارے پاواں دبا دیئوں۔ پاواں میں جنتر لگا دیئوں؟"

اس کی آواز سُن کر میں کسی قدر گھبرا سی گئی وہ بار بار یہی جملے دہرا رہی تھی۔ میں سُنتی رہی۔ پھر بالکل غیر ارادی طور پر اس سے چھٹکارا پانے کے لیے میں نے "ہاں" کہہ دیا۔

پھر معلوم نہیں مجھے کب نیند آگئی۔ اس دفعہ کی خاموشی نے اُسے پھر نڈر بنادیا۔ اب جب کبھی میں گھر کے کسی خاص کام میں مصروف ہوتی تو یہ بلا کی طرح نازل ہوجاتی۔ میرا سارا دھیان بٹ جاتا اور دل اس اندیشے سے دھڑکنے لگتا کہ نہ جانے یہ کس قسم کی شرارت کر بیٹھے۔

ایک دن میں اس کی ماں پر برس پڑی۔ وہ اکثر چاول گیلے کر دیتی تھی۔ مجھے گیلے چاول بالکل پسند نہیں تھے۔ بار بار کہنے، بتانے اور سمجھانے کے باوجود ہر روز وہ یہی غلطی کر دیا کرتی تھی۔ آج بھی اس نے چاول کا ستیاناس کر دیا۔ میں اس پر برس پڑی۔ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اسی طرح یہ لوگ میری کمزوریوں اور ہمدردی سے ناجائز فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ میری پریشانی کا انھیں احساس نہ تھا۔

اس دن میں نے کھانا نہیں کھایا اور بستر پر جا کر لیٹے لیٹے میں نے دل ہی دل میں یہ سوچ لیا تھا کہ اب میں انھیں کسی بھی صورت پر نہیں رکھوں گی۔ پانی ناک سے اونچا ہو گیا ہے۔ روز روز ان کے منہ لگنا بھی عقل مندی نہیں۔ آئے دن کی تکرار اچھی نہیں ہوتی۔

میں نے انھیں اپنے ہاں سے نکالنے کا مصمّم ارادہ کر ہی لیا۔ اس ارادے کے ساتھ ہی مجھے ایک طرح کا سکون بھی نصیب ہوا۔ لیکن اچانک مُنّی کسی بلائے ناگہانی کی طرح پھر نازل ہوئی۔

”تُمنا بھوک نئی کیا؟ مُجے بھوک لگّو تھی میں کھالی نا۔ تمّے بخار آگو ہے۔ لاؤ تمارے پاواں میں دبا دیوُں! ہاں! تمارے اِتنے بلّلا کے ختّاں نیچے پڑ کو ہیں نا! ارے تمے چپکے پڑیں نا۔ کیا بھی بولتے نئیں نا۔ میری

اماں کے اوپر کالی کو تم بمڑیاں مارتے ہو۔؟"

میں اُس کی آواز سُن کر جز بز ہو کر رہ گئی۔ غصے میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ میرے غصے سے بخوبی واقف تھی۔ میں بے قابو ہو کر بستر سے اٹھی اور بے تحاشا اس کے گال پہ ایک زبردست تھپڑ رسید کرنے ہی والی تھی کہ میرے اٹھے ہوئے ہاتھ خود بخود رک گئے اور غصہ کم ہونے لگا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ اس کی بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں آنسو ڈھلک رہے ہیں۔ میں کچھ لرزہ سی گئی اور پھر اس کی جانب کچھ دیر یوں ہی دیکھتی رہی، دیکھتی رہی وہ میری غضب آلود نظر کی تاب نہ لا سکی اور سہم کر نیچے فرش پر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوؤں کے قطرے زمین پر گرنے لگے۔ اس کی اس معصوم ادا نے میرے غصہ کو بالکل کافور کر دیا۔ میں اس کی ساری شرارتوں کو بھول کر اس پر قربان ہو اٹھی اور اپنے قریب بلا کر اُسے پیار کرنے لگی۔٭

۲۹ر فروری سنہ ۱۹۸۳ء
مدراس

مکرمی و محترمی خان صاحب !
آداب و نیاز !

تذکرۂ خواتین اسلام کے کالم کے لیے آپ نے "دخترانِ اسلام" کے کارنامے" کے عنوان کے تحت مجھے قسط وار مضامین رسالہ "روشن ادب" میں لکھنے کی پُرخلوص دعوت دی ہے۔ میں آپ کی بے حد ممنون اور متشکر ہوں کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ !

"دخترانِ اسلام کے کارناموں کا سلسلہ" سرکارِ دو عالمؐ، ازواجِ مطہرات، صحابیات، اور دیگر معزز و بہادر خواتین سے لے کر آج کی خواتین تک یہ کڑی آکر جڑتی ہے۔..... حالاں کہ اس مبارک عنوان پر قلم اٹھانے سے پہلے حضورؐ کی صاحب زادیوں، ازواج مطہرات اور صحابیات پر بڑا گہرا مطالعہ اور وسیع معلومات درکار ہیں پھر بھی میں اس نیک کام کو صحیح ڈھنگ سے اور انصاف کے ساتھ انجام دینے میں اپنی پوری لگن اور کوشش صرف کردوں گی۔ تاکہ آج کی دخترانِ اسلام ماضی کی دخترانِ اسلام کے کارناموں کو پڑھیں، اثر لیں اور عمل پیرا ہوں..... !

آپ کا نیک مقصد انشاء اللہ تعالیٰ ضرور پورا ہوگا۔ جو بھی کام اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر کیا جاتا ہے اس کا ثمر ناپائیدار اور انجام بُرا ہوتا ہے ...... اور جو بے لوث خدمات ہوتی ہیں، ان کے اثرات بھی پائیدار و استوار ہوتے ہیں اور انجام نہایت خوش کن، مبارک اور اطمینان بخش ہوتا ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ یہ سلسلہ ماہِ نومبر سے شروع کیا جا رہا ہے۔ ابھی کافی وقت ہے۔ پھر بھی میں آپ کی ہدایت کا لحاظ رکھتے ہوئے اگست تک انشاء اللہ تعالیٰ دو، تین مضامین ارسال کرنے کی پوری کوشش کروں گی۔

فنکار نمبر کے لیے تقریباً ایک ہفتہ سے ایک کہانی پر کام کر رہی ہوں۔ آج مکمل ہو گئی ہے۔ اس خط کے پورا ہوتے ہی پوسٹ کر دوں گی۔ آج بدھ ہے اور ہفتہ تک کہانی آپ کو مل جائے گی ....!

"افشاں" کی ہیروئن پورٹ بلیر کی ایک مغرور دوشیزہ ہے جو اپنی انا میں کھو کر اپنے مستقبل کے اچھوتے سپنے دیکھا کرتی ہے۔ اِسے اپنی جھوٹی شان اور جھوٹے سپنوں پر اتنا اعتماد اور بھروسہ ہے کہ وہ اُن کے پورا ہونے کا انتظار بڑی بے باکی اور استقلال سے کرتی ہے یہاں تک کہ اس کی عمر کی وہ بہاریں خزاں میں تبدیل ہونے لگتی ہیں، جو کبھی اپنے شباب و جمال پر نازاں تھیں ...... میرے خیال میں ایسے خواب عمر گزرنے کے بعد اگر پورے بھی ہو گئے تو ان کی تعبیریں یقیناً بھیانک ہی ہوں گی ......!

'افشاں' کے خواب ابھی اس کہانی میں ادھورے ہی ہیں۔

انجام تک نہیں پہنچے..... مجھ میں ابھی اتنا صبر نہیں کہ میں افشاں کے ساتھ ساتھ اس کے خوابوں کے پورا ہونے کا بھی انتظار کرتی۔ مگر میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس عجیب و غریب حسینہ کے اونچے سپنوں کی تعبیر کیا رنگ لائے گی...... اگر آپ بھی جاننا چاہیں تو چند سال اور انتظار کریں...... بھابی صاحبہ سے سلام کہیے اور بچّوں کے لیے بہت سی دعائیں..... !

خلوص کار

صبا صفی

افشاں

وہ اپنی انا کی چادر میں لپٹی اپنے خوش آئند مستقبل کی آرزومند تھی مگر ....!

ضوفشانی کا صلہ ملتا ہے کیا محفل میں
شمع جلتی ہے بھڑکتی ہے فنا ہوتی ہے!

جب میں اپنی جائے پیدائش جزیرۂ انڈمان (پورٹ بلیر) جاتی ہوں تو قدرت کے خوش نما مناظر میرے خیر مقدم کے لیے گویا سرِ تسلیم خم کئے کھڑے رہتے ہیں۔ بادِ صبا نکہتِ بہار سے میرے وجود کو معطّر کردیتی ہے۔ ہر ذرّہ میرے لیے آنکھیں بچھائے مہذب انداز میں فرشِ زمیں پر بچھا نظر آتا ہے۔ خوشبوؤں سے لپٹی ہوائیں جھوم جھوم کر اس جزیرے کے خوش گوار موسم کی خبر دیتی ہوئی آگے بڑھتی رہتی ہیں۔

یہ جزیرہ اپنے دامن میں بہت سی جان دار اور بے جان چیزوں کو لیے ہوئے ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو دل موہ لینے والی کشش قدرت نے عطا کی ہے۔ جس کا حُسن و جمال میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔ جس رُخ سے اور جس پہلو سے بھی اس جزیرے کو دیکھا جائے یہ اپنی مثال

آپ ہے۔!

جزیرہ انڈمان کی آبادی معیاری ہے۔یہاں کے رہنے والے خوش اخلاق اور ملنساری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ سادگی اور پاکیزگی ان کے رگ و پے میں بسی ہوئی ہے۔ فتنہ فساد، لڑائی جھگڑے سے کوسوں دُور، ذات پات اور امیر و غریب کا کوئی فرق مطلق نہیں۔ یہاں تک کہ مختلف ذاتوں میں شادی بیاہ بھی ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام شہروں کے مقابلہ میں اس چھوٹے سے جزیرہ کی ایک الگ تہذیب ہے۔اگر یہ کہا جائے کہ یہ جزیرہ ایک چھوٹا سا خوب صورت ہندوستان ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

اس جزیرہ کی خصوصیات میں یہاں کی دوشیزاؤں کو خاص درجہ حاصل ہے۔مگر ان میں سے زیادہ تر کنوارے پن کے بندھن میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ان کو شباب آنے پر مستقل بندھن میں باندھ دینا چاہیے تھا۔ مگر انھیں اپنے کنوارے پن کا احساس اتنا نہیں ہوتا جتنا انھیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ نوّے فیصد لڑکیاں دفاتر اور اسکولوں میں کام کرتی ہیں۔ان کی خوب صورتی محض چار دیواری کی زینت بن کر نہیں رہتی۔ ان دوشیزاؤں کے حُسن میں بلا کی کشش اور جاذبیت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں کوئی خاص تاثیر ضرور پوشیدہ ہے جس نے ان حسین خوب رؤوں کے حُسن و جمال کو دل کشی کی معراج عطا کی ہے۔ گندمی رنگ بڑی بڑی کنول نما آنکھیں، آنکھوں پر گھنیری پلکوں کا خوب صورت سایہ، کمان نما بھویں، سُتواں جیسی ناک، دو خوب صورت پنکھڑیوں جیسے لب، انار کی طرح دہکتے گال، چوڑی پیشانیاں، کالی کالی گھنگھور پریشان

گھٹاؤں کی طرح زلفیں، قدمیانہ، بڑا ہی دل کش انداز، طبیعت میں بلا کی سادگی، اور پاکیزگی کا امتزاج، وضع قطع پاک و شفاف، بھولی بھالی متانت سے لبریز شکل، جنھیں دیکھ کر چاند کی معصوم کرنیں بھی شرماجائیں۔ دل جیسے صاف پاک آبشار، زبان میں غضب کی شیرینی، رفتار و گفتار میں وہ ناز و انداز کہ جس پہ قدرت کا کوئی ذرّہ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان سب خصوصیات کے باوجود یہاں کی زیادہ تر نیک لڑکیاں اس قدر سادہ اور باحیا ہیں کہ اپنے من پسند ساتھی کو چُننے کی بھی جرأت نہیں کرسکتیں۔ اگر یہ احساس پیدا بھی ہوا تو سماج کے ڈر سے دل کے جذبات دل کے اندر ہی مسوس کر رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی عمر وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگتی ہے۔ اور جذبات دم توڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس وقت انھیں اپنی عمر کا اتنا احساس ہوتا ہے کہ اُن کے سرخ و روشن چہروں کو مایوس اور پھیکا کردیتا ہے۔ جس سے وہ بالکل پژمردہ ہوجاتی ہیں۔

یہ حقیقت ہے افسانہ نہیں۔ اور نہ ہی میرا یہ حقیقت پر مبنی بیان کوئی کہانی یا افسانہ ہے۔ جب اس جزیرہ انڈمان کی دوشیزائیں مایوسیوں سے غمگینی کا شکار نظر آنے لگتی ہیں تو اس پاک سرزمین کے سارے نظارے خاموش خاموش اور بے جان سے نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ان میں بھی کوئی کشش باقی نہیں رہتی ہے۔ اور یہ سارے ہرے بھرے خوب صورت نظارے سب کے سب پھیکے پڑجاتے ہیں۔ کیوں کہ ان سب کی خوب صورتی کا راز صرف انڈمان کی خوب صورت حسینائیں ہیں اور کوئی نہیں!

ان ہی کنواری اور حسین دوشیزاؤں میں سے ایک ایسی دوشیزہ کا ذکر کرنا چاہتی ہوں جو مجھ سے بہت قریب ہے۔ گویا وہ میری اپنی ہے، جس سے میرا روحانی اور جذباتی رشتہ ہے۔ غرض کہ ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ لیکن اس کے بارے میں کیا لکھوں اور کس طرح اور کیسے اپنے الفاظ و بیان میں اس کے کردار کو سمو دوں میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

وہ بہت ضدی اور خوددار طبیعت کی ہے۔ جب بھی میری ملاقات اس سے ہوتی ہے اور میں اس کا اداس چہرہ دیکھتی ہوں تو بہت رنجیدہ خاطر اور اداس ہو جاتی ہوں! میری ساری خوشیاں، سارے ولولے ایک دم فنا ہو جاتے ہیں۔ میری ان آنکھوں کو بڑا دکھ ہوتا ہے۔ دل کو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔ اپنے اطمینان کے لیے جب بھی میں نے افشاں سے اس کی اداسی اور خاموشی کا سبب پوچھا تو مجھے اس کے ایک پھیکے سے تبسم کے سوا اور کچھ جواب نہ ملا۔ حالاں کہ اُس کے اِس گہرے اور بے جان تبسم میں ہزاروں داستانیں اور مسکانیں پوشیدہ ہیں۔ ہو سکتا ہے ہر کنواری لڑکی کے دل میں ایسے راز پنہاں ہوتے ہوں۔ لیکن افشاں کا راز بڑا گہرا اور عمیق ہے۔ اس کے متعلق میں نے ہمّت کر کے کئی بار اس کی زبان سے اس کے راز کو سُننا چاہا، اس کے دل کو ٹٹولنا چاہا لیکن ہر بار اور ہر کوشش میری رائیگاں ہوئی۔

میرا مزاج خاصّا شوخ و بے باک ہے۔ خودداری اور ملنساری کا سرچشمہ۔ اپنی اس فطرت کے سہارے میں نے اُسے اپنے سے بے تکلّف کرنے کی بہت کوشش کی لیکن زیادہ اصرار سے بحث مباحثہ کا سلسلہ

شروع ہونے کا اندیشہ رہتا۔ بحث و مباحثہ سے بدگمانی اور بدگمانی و تکرار سے نوبت اَن بَن تک آسکتی ہے ۔ یہ سوچ کر میں اپنی عادت کے مطابق گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑ دیتی اور دوسرے ہی لمحے ہنسی مذاق اور تفریحی گفتگو کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

جب میں حد سے زیادہ جذباتی ہو جاتی ہوں تو میرے نزدیک کسی بھی چیز کی کوئی انتہا نہیں ہوتی ۔ مگر افشاں کے مقابلہ میں ہر چیز کی ایک حد مقرر ہے ۔ وہ جب ہنسنا چاہتی ہے تو اُس وقت تک ہنستی ہے جب تک اس کا دِل چاہتا ہے ۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ اس ہنسی میں جان نہیں ہے اس کی ہنسی یقیناً کیفیاتِ مسرّت سے عاری نظر آتی ہے۔

میں جب بھی اپنی سسرال (مدراس) سے یہاں آتی ہوں تو میری پہلی ہی ملاقات میں افشاں کی شادی کا ذکر ہوتا ہے ۔ اور جب اس قسم کا ذکر ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ افشاں اس ذکر سے، اس قسم کے بیان سے ایک طرح کی کوفت محسوس کرتی ہے ۔ جیسے اس کے لیے اس لفظ میں کوئی دلچسپی اور کشش باقی نہیں رہی ۔ اور نہ اس قسم کی خوشی کا تصوّر اس کے دماغ میں نہاں ہے ۔ اگر کچھ اس کے دل میں ہے تو گویا اداسیوں اور مایوسیوں کا ایک مدفن ہے ۔ اس کے دل میں ہزاروں درد کروٹیں بدل رہے ہیں۔ جس کے احساس سے وہ کراہ رہی ہے ۔ مگر خاموشی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا ہوا اس کا درد کیا ہے وہ تو مجھے بھی معلوم نہیں ! لیکن ایک ایسا دردِ بیکراں ہے جس کا احساس اکثر اسے خیالوں اور تصوّرات کی ایسی ایک دنیا میں لے جاتا ہے جہاں صرف وہ ہی ہوتی ہے اور اس کی تنہائی کے

تصوّرات !

جب لڑکیاں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں تو نہ جانے کیا کیا اور کیسے کیسے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ افشاں نے بھی نہ جانے کتنے حسین خواب دیکھے ہوں گے ! اور کیسے کیسے تصوّرات میں حسین پھول کھلائے ہوں گے ؟ مگر خواب تو خواب ہی ہوتا ہے جو پرچھائیں کی طرح سے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

افشاں کی ایک بوڑھی ماں ہیں۔جن کی ساری ذمہ داری افشاں کے نازک کندھوں پر ہے۔ اپنی ماں کے سوا افشاں کے نہ کوئی دوست نہ کوئی خویش و اقربا ! جو کچھ بھی ہے وہ اس کی بوڑھی ماں ہیں جنھوں نے اُسے بچپن سے جوانی تک پرورش کر کے اس قابل بنایا کہ وہ اُن کے بڑھاپے کا سہارا بن گئی ۔

افشاں اور اس کی بوڑھی ماں دونوں خود دار ہیں اور دونوں نے کبھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اُن کی اس عادت کو غرور و تمکنت سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر ان کی خودداری میں نہ تو غرور ہے اور نہ خاص و عام کا امتیاز۔

افشاں اسکول میں بچّوں کو پڑھاتی ہے اور انھیں اچھّی اچھّی اور نیک تعلیم دیتی ہے۔ بچّوں کے درمیان رہ کر وہ اپنے دل کا درد کم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بچّوں کے ساتھ کبھی نرمی اور کبھی سختی کے ساتھ پیش آتی ہے۔ جب کھیل کود کا وقت آتا ہے تو بچّوں کے ساتھ خود بھی بچّہ بن جاتی ہے وہ بہت سمجھ دار اور مہذّب ہے۔ اس لیے جس طرح کا ماحول ہوتا ہے اسی

رنگ میں خود کو ڈھال لیتی ہے۔ خواہ دل کا حال کچھ بھی ہو۔

شادی کی عمر بھی لڑکیوں کے لیے کیا چیز ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ شباب قوسِ قزح کے سات رنگوں سے رنگا ہوا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں تناسبِ اعضاء کا وہ عالم ہوتا ہے کہ فرشتہ صفت انسان بھی بہک کر ایک نظر دیکھ لیتے ہیں۔ پھر عام انسان تو انسان ہی ٹھہرے۔ ان کی طبیعت للچائے بغیر کیسے رہ سکتی ہے۔

افشاں بھی ایسے رنگ میں رنگی ہوئی جوانی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تو چاروں طرف سے نفس پرست نگاہوں کی بھرمار ہونے لگی۔ لوگ درندوں کی طرح کھا جانے والی نظروں سے تکنے لگے۔ مگر جو شریف نوجوان ہیں وہ اُسے ایک نگاہ دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھر کر رہ جاتے ہیں۔

افشاں کے لیے بہت سے اونچے اور مہذّب گھرانوں سے پیغامات آنے لگے مگر اس کے دل پر کسی ایک کا بھی رنگ نہ چڑھا۔ اس کے خوابوں کا شہزادہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ اس کے دل کے سوا شاید اُسے بھی معلوم نہیں ہے۔ جس کے لیے اس نے دوسری نعمتیں اور برکتیں بھی ٹھکرا دیں۔

وہ بچپن ہی سے کچھ زبردست مجبوریوں کا سامنا کر رہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی ذمّہ داری اس کی ماں ہے۔ اکثر وہ اپنے خیالات میں کھو جاتی ہے کہ اگر اس کی شادی ہو بھی گئی تو پھر اس کی بوڑھی اور مجبور ماں کا خبر گیر کون ہو گا۔ اُن کی خدمت کون کرے گا؟ کون سہارا دینے گا؟

طوفانی ہوا سے جب سمندر کی لہریں کانپ جاتی ہیں تو شور مچاتی ہیں۔ پھر یک لخت طوفان کے غائب ہوتے ہی تھم جاتی ہیں، خاموش ہو جاتی

ہیں ۔ بالکل اسی طرح افشاں کے احساسات وجذبات کا عالم ہے ۔ اشک باری کے بعد دل کا غبار بھی ذرا ہلکا ہو جاتا ہے ۔ دھڑکنیں ٹھہر جاتی ہیں اور پھر ایک دم سکوت چھا جاتا ہے ۔!

وقت گزرتا گیا، زمانہ بدلتا گیا، پورٹ بلیئر کی فضاؤں میں کتنی ہی تبدیلیاں ہوتی گئیں ۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی پورٹ بلیئر کا اب نقشہ ہی بدل گیا ہے ۔ یہاں کے باشندگان میں بھی تبدیلی آئی ۔ اُن کے خیالات میں ردّو بدل پیدا ہوا ۔ نئی نئی تعلیم آئی، نئے نئے لوگ نئے نئے خیالات لے کر آئے ۔ لیکن افشاں اس ماحول میں بھی کبھی کسی وقت نہیں بدلی ۔ اُس کا خیال نہیں بدلا ۔ اس کی وضع داری میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔ ہاں ! اگر کچھ تبدیلی ہوئی تو اتنی کہ اس کی خاموشی انتہا کو پہنچ گئی ۔ وہ ایک کرب ناک درد میں مبتلا ہو کر وہ تنہائی پسند ہو گئی ۔ اپنے آلام و مصائب کو اپنے دل میں چھپائے جی رہی ہے ۔

وقت نے طرح طرح کے تیور بدلے ۔ لیکن افشاں کی نگاہ میں کوئی برا نہیں ہے ۔ کوئی خراب نہیں ہے ۔ نہ کسی سے کبھی کوئی بازپرس کرتی اور نہ بلا وجہ کوئی شکوہ اور شکایت کرتی ۔!

افشاں دنیا کی روشوں سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکی ہے ۔ اُسے معلوم ہے کہ جہاں بھلائی کی نیت کی جائے وہاں برائی اور ذلّت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا ۔ یہی وجہ ہے کہ افشاں نے اہلِ دنیا کے سامنے اپنا سر کبھی خم نہیں کیا ۔

دل گیر اور مغموم ہونے کے باوجود بھی افشاں کریم النفس اور فراغ دِل واقع ہوئی ہے ۔ ہر اس غریب کے لیے اس کا دل دھڑکتا ہے جو

بے سہارا اور حاجت مند ہے۔ وہ کبھی کسی کے سامنے اپنا دکھڑا نہیں روتی۔ اپنے غم والم کا مظاہرہ وہ اس وقت کرتی ہے جب اس کی زندگی تنہا ہوتی اور وہ سب کی نگاہیں بچا کر اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی ہے۔

اکثر وہ اپنے دلی جذبات کو چھپا کر اپنے آپ کو بے فکر اور بے غم ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جو لوگ اس کے دلی غم و اندوہ سے واقف نہیں ہیں وہ اسے خوش و خرم سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اغیار اس کی دلی کیفیت سے بالکل بے بہرہ ہیں۔

افشاں کی پروان چڑھتی ہوئی جوانی جو آگ کی طرح بھڑک رہی ہے وہ اس آگ میں خود ہی جل سی رہی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ افشاں کو اس بھڑکتی ہوئی آگ سے کوئی خوف ہے نہ کوئی ڈر! مگر کب تک وہ اس آگ کو دباتی رہے گی۔ صبر و تحمل کب تک ساتھ دیتے رہیں گے؟ ایک نہ ایک دن تو اس کا دہکتا ہوا جسم اس کے لیے بار بن جائے گا۔ تب وہ سلگتی ہوئی آگ کو شعلہ بننے سے کیسے روک پائے گی۔

افشاں ایک خوب صورت اور حسین لڑکی ہے۔ اور ایک حسین لڑکی کے جذبات کا صبر و تحمل کب تک ساتھ دیں گے! لیکن افشاں کے اندرونی جذبات بھڑکتے ہیں اور پھر تھم جاتے ہیں۔ اس کی آرزوئیں جاگتی ہیں اور سو جاتی ہیں۔

اکثر وہ اپنی تنہائی کے اوقات میں سوچا کرتی ہے کہ شادی ایک مبارک اور پاکیزہ بندھن ہے۔ کیا میری بھی شادی ہوگی؟ اگر ہوگی تو میرے خوابوں کے شہزادے سے ہی ہوگی؟ کیا مجھے میرا پسندیدہ فرد مل جائے گا؟

کیا حقیقت میں وہ دن بھی میرے لیے آئے گا، جس دن کے انتظار میں میری آنکھیں روتے روتے سوج گئی ہیں۔ دماغ معطّل سا ہو گیا ہے۔ دل کی دھڑکنوں کی رفتار کم ہو گئی ہے۔ روح کی پکار اب ہلکی ہونے لگی ہے اور امنگیں بے جان ہوتی جا رہی ہیں!

پھر وہ یک لخت بہت اداس ہو جاتی ہے۔ "نہیں نہیں! میری شادی کیسے ہو گی؟ میں شادی کرنے کے لیے نہیں بلکہ دنیا میں حکمِ خدا وندی سے اپنی ماں کی ذمہ داری کو انجام دینے آئی ہوں۔ شادی کا مفہوم "شادی" ہے۔ یعنی خوشی اور مسرّت! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے خوشی نصیب ہو! خوشی تو اوروں میں بانٹ دی گئی ہے۔ جتنی خوشیاں تھیں سب کی سب تقسیم ہو چکی ہیں۔ میرے حصّہ میں صرف اندوہ و غم، تنہائی و فراق، آنسو اور آہیں ہی آئی ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میرے مالک نے میرے نصیب میں کچھ تو عطا کیا ہے۔ ورنہ میں کس طرح جیتی! زندگی بغیر ماں کے سہارے بوجھ بن جاتی! ابھی میرا ایک سہارا تو ہے! خواہ وہ سہارا تنکے ہی کا کیوں نہ ہو! مگر مجھے ڈوبنے سے بچانے کے لیے کافی ہے۔ جب اتنا بڑا سہارا مجھے میسر ہے تو میں کیوں کسی سے گلہ کروں! شادی دنیاوی کھیل ہے! دنیاوی خوشیوں کا ایک فرضی نام ہے۔ مجھے تو آخرت کی خوشیاں حاصل کرنا ہیں۔ پھر ان دنیاوی جھمیلوں میں کیوں پڑوں!"

وہ یہ سب کچھ سوچ کر بہت مطمئن ہو جاتی۔ پھر ایسا لگتا کہ اب افشاں شعلہ بننے کی بجائے برف بن چکی ہے! لیکن عورت ہونے کے ناطے فطری طور پر جب کبھی وہ کسی سہاگن کو دیکھتی ہے تو اس کا دل چاہتا ہے

ہے کہ کاش! وہ بھی ایسے ہی رنگ برنگے لباس اور طرح طرح کے زیورات
سے آراستہ ہوتی۔ مگر خود کو سنوارنے کے لیے جب وہ آئینہ کے سامنے جاتی ہے
تو مایوس ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ اس کا دل اندر ہی اندر بیٹھنے لگتا ہے۔
اور چند موٹے موٹے آنسوؤں کی بوندیں اس کے رخساروں کو جلاتے ہوئے
اس کے دامن کو تر کر دیتی ہیں۔

افشاں کبھی اپنی خواہش کے مطابق خود کو ڈھال نہ سکی۔ وہ اپنی
تمام تر تمناؤں کا خود گلا گھونٹتی رہتی ہے۔ اس کی تسکین کا سہارا صرف
اس کی تنہائی کے آنسو اور آہیں ہیں!

وہ کبھی کوئی قیمتی چیز نہیں خریدتی ہے۔ اگر کبھی بھولے سے
یا اپنی خواہش سے خرید بھی لے تو وہ چیز اسے خوش کرنے کی بجائے پژمردہ
اور رنجیدہ کر دیتی ہے۔

جس دل میں درد ہوتا ہے تو وہ درد آواز میں شامل ہو جاتا ہے
افشاں درد سے معمور، مجسم درد کا پیکر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ افشاں
کی آواز بھی درد میں ڈوبی ہوئی رہتی ہے۔ وہ بہت اچھا گاتی ہے۔ اس
کی آواز میں اتنی کشش اور سوز و گداز اور ترنم خدا داد ہے۔ خدا بڑا کارساز
ہے۔ وہ اپنے بندوں کے درد و غم کا علاج بھی کسی نہ کسی بہانہ کر دیا کرتا ہے
افشاں نے بھی اپنے درد کا مداوا اپنی آواز میں تلاش کر لیا۔ جب
کبھی اُسے درد سے بے قراری ہوتی ہے۔ تو وہ کچھ گا کر اپنے غم کا بوجھ ہلکا کر لیا
کرتی ہے... انسان کا ایک یہ بھی مزاج ہے کہ وہ کبھی کبھی موسیقی اور اثر
انگیز اشعار کا سہارا لے کر اپنے دل کو بہلا لیا کرتا ہے۔ مجازی ماحول میں

بھی موسیقی انسان کو اپنے رنگ سے متاثر کئے بغیر نہیں رہتی ہے۔

جب افشاں نے دیکھا کہ موسیقی کی " لے اور سُر" درد کا درماں بن جاتے ہیں تو افشاں موسیقی کو کامل طور پر اپنانے کی کوشش کرنے لگی اور اب تو افشاں سُروں کی لہروں میں اس قدر کھو گئی ہے کہ اُسے جیسے اپنے دردِ بیکراں کا ایک مستقل علاج نصیب ہو گیا ہے۔ اب ہے وہ اور سروں اور اس کی آواز کا سنگم!

اب مجھے یقین ہے کہ افشاں خُدا کے دئیے ہوئے اس عظیم الشان عطیہ کو کبھی اپنے سے جُدا نہیں کرے گی۔ کیوں کہ یہ راگ و نغمہ ہی اس کی منزلِ مقصود کا ضامن ثابت ہو گا اور یہی وہ راستہ ہے جس سے گزرتے ہوئے شاید اس کو اپنے خوابوں کی تعبیر مل جائے۔

"خدا کرے ایسا ہی ہو!

••

۱؍ دسمبر سنہ ۱۹۸۳ء

مدراس

میرے محترم انیس بھائی صاحب!

سلام مسنون!

جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں انڈین ایر لائنس میں ایر ہوسٹس کے فرائض انجام دے چکی ہوں۔ اُن دنوں ملازمت کے دوران مجھے بہت سے واقعات اور تجربات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔...... میں چوں کہ پورٹ بلیر انڈیمان سے وابستہ تھی۔ لہٰذا یہی سمجھتی رہی کہ دنیا کی ہر جگہ انڈیمان ہی جیسی ہوگی ـــ!

یہاں میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ پورٹ بلیر کے قدرتی مناظر بے حد دل کش، جان دار اور شان دار ہیں۔ ان کی خوب صورتی اور دل فریبی کا یہ عالم ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ خدا نے دنیا کی ساری خوب صورتی انڈیمان کو ہی عطا کر دی ہے۔...... وہاں کے باشندوں کو فرشتوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ وہ سب کے سب بہت سیدھے سادے بھولے بھالے، اخلاق مند، اتحاد و سالمیت اور پیار و محبت کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اسی بنا پہ میں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ مجھے ہر جگہ انڈیمان

جیسا ہی ماحول ملے گا۔

اگر آپ اجازت دیں تو چلتے چلتے آپ کو چند سطروں کے ذریعہ میری پہلی روانگی جو پورٹ بلیر سے کلکتہ کے لیے ہوی تھی اور وہاں میرے قیام کے دوران جن تاثرات اور احساسات سے میں دوچار ہوی تھی ان کی کچھ جھلکیاں پیش کرتی چلوں۔

ہوا یوں کہ جب میں پہلی بار کلکتہ آئی تو میں نے وہاں کے ماحول اور وہاں کے لوگوں کو پورٹ بلیر والوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے مختلف پایا۔ شروع شروع میں لوگوں کی بدسلوکی، بداخلاقی اور بے رخی دیکھ کر مجھے بڑی پریشانی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو میں رو پڑتی تھی۔ مجھے کچھ ایسا لگتا تھا کہ میں کسی دوسری دنیا کی کسی دوسری مخلوق کے ساتھ رہنے کو آگئی ہوں ــــــ!

بہر کیف......! رفتہ رفتہ میں حالات کو سمجھنے اور اس پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی...... حالات سے سمجھوتہ انسان کے لیے یقیناً ضروری ہے۔ ورنہ زندگی دوبھر ہو جاتی ہے۔ میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ حالات سے سمجھوتہ کرلوں گی۔ اور پھر میں اس پر عمل پیرا ہو گئی۔ میں نے اپنے شعور کی نظروں سے اپنے اطراف کا بغور جائزہ لینا شروع کیا تو مجھے زندگی اور زندہ رہنے کے بارے میں بہت سے فلسفے معلوم ہوئے اور تب ہی سے میرے اندر لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ہر روز ایک نیا واقعہ، نیا تجربہ، نیا حادثہ اور نیا منظر......! بس اسی طرح حالات کی بھٹّی میں تپتے تپتے جب میرا شوق اور میرے جذبات دن بدن پختہ اور ٹھوس ہونے لگے تو میں آنکھوں دیکھی ہر سچائی کو اپنے قلم کی زد میں پرونے لگی...... اور جب ایر ہوسٹس کے فریضہ پر معمور ہوی تو میرے شوق اور جذبوں میں بے چینی کی لہریں دوڑنے

لگیں۔ اس بے چینی اور تڑپ نے مجھے انسانوں کو پڑھنے کی صلاحیت عطا کی ۔۔۔!

ایرلائنس کی ملازمت میں لڑکیوں کی اکثریت یقیناً ملک کی ترقی کی غمازی کرتی ہے۔ جہاں لڑکیاں نہایت، بے باک پھرتی اور چستی سے اپنی اپنی قابلیت اور صلاحیت کا نمایاں مظاہرہ کرنے میں کسی بھی طرح مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ان کا حسنِ سلوک، اندازِ بیان، خدمت کا بے لوث جذبہ ان کا دلکش اور مہذب لباس، ان کا مثالی کردار اور بے پناہ حسن اور ان کی دلیری یہ سب ایرلائنس میں کام کرنے والی لڑکیوں کے کردار کے بے مثال اور اچھوتے جواہر پارے ہیں۔!

میں نے پہلے سے سُن رکھا تھا کہ ایرہوسٹس بہت قابل دلیر اور فرض شناس ہوتی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی ایک چیلنج کے حصول کے تحت ایرہوسٹس بننا منظور کیا۔ ان دنوں میرے اندر کچھ ایسے جذبے ابھر رہے تھے کہ جن کی بنا پر میں نئے نئے تجربے کرنے کی خواہش مند تھی۔۔۔۔۔ کوئی نیا اور اچھوتا کام کرنے کی متمنی تھی۔ لہذا ہوسٹس بننے کے بعد میرے شعور میں غیر معمولی تبدیلیاں تیزی سے رونما ہونے لگیں۔ مگر میرے اندر کسی قسم کی کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوی۔ میں جیسی تھی بالکل ویسی ہی رہی۔ یعنی وہی سیدھے سادے مزاج کی خالص ہندوستانی لڑکی ۔۔۔! مگر ہاں! میری سوچوں کے انداز میں فرق ضرور آنے لگا۔ میں بہت حد تک بڑے شہر کے قاعدے اور قانون کو پرکھنے اور خوب اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔۔۔۔!

جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکی ہوں کہ پورٹ بلیر سے میرا گہرا تعلق ہے۔ ۔۔۔۔ میں بار بار پورٹ بلیر کا ذکر کر رہی ہوں تو اس سے بس یہی مراد ہے کہ یہ ایک بہت ہی بچھڑا ہوا جزیرہ ہے جو مدراس سے تقریباً 1750 کلومیٹر کی دوری پر اور

کلکتہ سے تقریباً 1500 کلو میٹر کی دوری پر گہرے نیلے سمندر کے دامن پر رونق افروز ہے۔ ابھی تک ترقی کی لہریں اس جزیرے کے ساحلوں کو نہیں چھو ئیں۔ یہاں محدود دائروں میں محدود لوگوں کی آبادیاں ہیں۔ محدود رسم ورواج، محدود سوچ وچار اور محدود خیالات اور تخیلات۔ جہاں اچھائیاں ہی اچھائیاں ہیں۔ اور بُرائی کے نام کی کوئی چیز وہاں نظر نہیں آتی۔ جہاں انسانیت کا بول بالا ہے۔ اونچ نیچ، ذات پات، بھید بھاؤ اور امیری غریبی کے بندھنوں سے وہاں کے لوگ بالکل آزاد ہیں اور محبت و بھائی چارے کے پیغام کے حامی ہیں۔ جہاں چھل ہے نہ کپٹ، نہ دھوکا بازی ہے اور نہ ہی بے ایمانی یا لوٹ مار ــــ! بس سیدھے سادے وچاروں کے لوگ اپنی اپنی زندگیاں مل جل کر ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر گزار دینے کے قائل ہیں۔ ایسی مبارک اور پاک سرزمین پر میرا جنم ہوا۔ ظاہر ہے میرا مجسم وجود بھی سادگی اور خالص سیدھے سادے ہندوستانی رنگ میں ملوث تھا۔ 'تھا' سے میری مراد یہ نہیں کہ اب میں بہت ایڈوانس ہو گئی ہوں اور خالص ہندوستانی نہیں رہی ہوں۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہے عمر کے ساتھ ساتھ حالات اور تجربوں سے انسان میں سنجیدگی اور متانت اور خیالات میں پختگی اور استواری پیدا ہو جاتی ہے مگر یہاں پھر بھی میں یہی کہوں گی کہ انسان کی فطرت یعنی اس کے مزاج کو جو اس کی طبیعت کا خاصہ ہے کسی بھی حال میں کسی بھی ماحول میں یا عمر میں پورے کا پورا بدلہ نہیں جا سکتا۔ چونکہ یہ انسانی فطرت کی افتاد کا قدرتی تقاضا ہے۔۔۔۔۔!

بہرحال میں یہ کہہ رہی تھی کہ جب میں اپنی انتہا درجہ کی سادگی اور ہندوستانی پن کے ساتھ کلکتہ جیسے شہر میں آئی اور مجھے ایر ہوسٹس جیسی گلیمرس

ملازمت حاصل ہوئی تو ایسے ماحول میں مجھے قدم قدم پر بڑی پریشانیاں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جس کا اظہار چند سطروں کے ذریعہ ناممکن ہے۔ مگر ہاں! اس سے اتنا ضرور ہوا کہ حالات، اسباب اور تجربوں نے مجھے جینے کے نئے انداز اور اسلوب سے روشناس کروادیا۔

میرے ساتھ کام کرنے والی ساری کی ساری لڑکیاں بہت ایڈوانس اور نئے خیالات کی اور بے حد ترقی پسند تھیں۔ میں ہر لحاظ سے ان کے برعکس تھی ان کے انتہائی ترقی پذیر خیالات میرے خیالات سے میل نہیں کھاتے تھے۔ لہذا میں ان کے ساتھ وقت گزارنا یا زیادہ بات چیت کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ مگر ہاں! میں انھیں زیادہ سے زیادہ سُننا پسند ضرور کرتی تھی۔..... ان کی پارٹیوں اور محفلوں میں شرکت سے گریز کرتی تھی۔ ان کی دعوتوں میں نہیں شریک ہوتی تھی اور نہ ہی ان کے ساتھ سینما گھروں تک جانے کی خواہش مند تھی۔ میں تنہائی اور خاموش زندگی کی عادی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سب کی سب مجھ سے ہمیشہ خفا رہا کرتی تھیں اور تنگ آکر میرے متعلق کچھ غلط سلط باتیں بھی کرنے لگی تھیں۔..... جیسے ! میں بہت مغرور ہوں، احساسِ برتری کا شکار ہوں پورٹ بلیر جیسی پچھڑی ہوئی جگہ سے وابستہ ہوں لہذا میں بالکل جنگلی ہوں۔ کچھ نہیں جانتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ .... !

میں نے جب یہ سُنا تو مجھے ان کی باتوں کا بُرا نہیں لگا۔ بلکہ یہ خیال آیا کہ جدا جدا لوگوں کے خیالات بھی جدا جدا ہی ہوتے ہیں اور سوچنے اور سمجھنے کے انداز اور طریقے بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں ان کا کیا قصور ...... !

مجھے اپنی کم گوئی اور حد لگانہ طبیعت پر فخر تھا۔ کیوں کہ میں کم بولتی تھی اور مشاہدہ زیادہ کرتی تھی ..... کم گوئی انسان کو سنجیدگی اور زیادہ سوچ سمجھ کر بات کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔ اور انسان بہت کچھ کم مدّت میں حاصل کر لیتا ہے۔ جو باتونی یا بے کار کی باتیں کرنے والے لوگ ایک عرصہ میں بھی حاصل نہیں کر پاتے۔

بہر حال..... ! میں نے ایک دن اپنے آپ سے سوال کیا کہ لوگ دوسروں کی برائیوں کو اُجاگر کرنے کی کوشش میں کیوں لگے رہتے ہیں وہ اپنی برائیوں اور خامیوں پہ نگاہ کیوں نہیں ڈالتے..... تو جواب مِلا کہ دنیا میں کئی قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں یہ بھی ایک ذات ہے جس کا مقصد صرف غلط کام کرنا ہے۔ ایسے لوگ نہ تو کچھ کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو کرنے دیتے ہیں۔ بلکہ اپنی پوری عمر دوسروں کو بدنام کرنے اور برباد کر دینے میں صرف کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ گم نامی کی زندگی گزار کر بالآخر گم نامی کی کھڈ میں گر کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔

بھائی صاحب ! جب تک ملازمت میں رہی میں نے بہت کچھ سیکھا۔ سمجھا اور اتنا جان لیا کہ انسان صرف موت کے انتظار میں جیتا ہے اور زندگی اور موت کا درمیانی حصّہ انسان کی آزمائش کا دَور ہوتا ہے۔..... اس مدّت میں جو جیسا کرتا ہے اُسے ویسا ہی پھل ملتا ہے۔

ایر لائنس کے تجربے اور معلومات نے میرے قلم میں رُوح پھونک دی۔ میں نے ایر ہوسٹس پہ بھی بہت سی کہانیاں لکھی ہیں.....

جو بھی حادثات اور واقعات پیش آئے تھے ان سب کو میں نے افسانوی رنگوں میں ڈھالا ہے۔..... فی الحال "گُل جب کھِلتے ہیں تو خار مسکراتے ہیں" حاضر ہے۔ اس افسانے کا ہیرو ہوائی جہاز کا پائلٹ ہے۔ ہیروئن کا کردار بھی جان دار ہے۔ دراصل مجھے ان دونوں کرداروں نے بے حد متاثر کیا۔

پُورے کا پُورا افسانہ حالاں کہ بے لوث و پاک محبت کی فضا میں مہکتے ہوئے رنگین پھولوں کی بارش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کی تحریروں میں کتنا درد اور کتنا سوز پنہاں ہے کہ پڑھتے سمے خود بخود آنکھوں کی پلکوں میں نمی کا سا احساس ہونے لگتا ہے.....!

غلط فہمیاں اور مجبوریاں بھی کبھی کبھی انسان کو ایسے خطرناک اور بھیانک دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیتی ہیں کہ اس پر کھڑے ہو کر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کدھر جائے اور کیا کرے۔..... اور جب سمجھ میں آتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے.........!

امید ہے آپ اچھے ہوں گے.......!

آپ کی بہن

صبا مصطفٰی

گُل جب کِھلتے ہیں تو خار مُسکراتے ہیں

موسم بہت سہانا اور سازگار تھا۔ جنوبی ہوا کے سرد جھونکوں نے ماحول کو اور بھی لطیف اور خوش گوار بنا دیا تھا۔ ساری فضا معطر اور سرشار نظر آ رہی تھی۔

دیبا کی خوشی بھی آج شباب پر تھی۔ خلافِ معمول آج وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

ایک تو خوش گوار موسم کا اثر، دوسرے اس کی قابلِ فخر کامیابی! وہ کیوں نہ خوش ہوتی! اس ناگہانی مسرت پر اُسے خود بھی حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے تو اپنے خواب و خیال میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ اتنی جلدی بین الاقوامی شہرت کی مالک بن جائے گی۔ لیکن اپنے سامنے ملک اور بیرونِ ملک سے آئے ہوئے بہت سے خطوط کو دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا اور وہ یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

ان ہی جذبات و احساسات کے تحت وہ خوشی سے نہال بار بار سامنے کھلی ہوئی کھڑکی کے قریب جاتی اور سائبان کے سائے تلے گملوں میں کھلے ہوئے رنگ برنگ گلابوں کو نظروں سے چوم لیتی تھی۔

ہوا کے سرد جھونکے اُسے بار بار گلے لگا رہے تھے وہ بھی ان مہکی ہواؤں کے نرم جھونکوں سے مسحور ہو رہی تھی! اور یہی ہوا کے سرد جھونکے خوب صورت

پھولوں کو چھیڑ چھیڑ کر انھیں بھی چومنے اور رقص کرنے کے انداز سکھا رہے تھے پھول شرما رہے تھے، کلیاں مسکرا کر کھل رہی تھیں اور ان کی دل کش خوش بوؤں سے سارا ماحول مہک رہا تھا۔ سامنے بچھا ہوا فرش زمردیں کتنا خوب صورت اور حسین معلوم ہو رہا تھا۔

دیبا اس خوب صورت ماحول کو دیکھ کر بہت مسحور ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ آج جی بھر کر خوشی کے گیت گائے اور رقص کرے۔

اچانک اس کی نگاہ بیرون ملک سے آئے ہوئے ایک خط پر پڑی۔ اس نے اُسے بہت محبت سے اٹھایا۔ بہت پیار اور نزاکت بھرے انداز سے لفافہ چاک کیا اور بے قراری سے خط کھول کر پڑھنے لگی۔

"دیبا! میری جانِ محبّت اور میری زندگی! دہلی سے نکلنے والے ایک فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ تمہارا دل کش نام ایک صفحہ پر دیکھ کر مجھ پر ایک محویت سی طاری ہو گئی۔ تمہارے نام کی کشش نے افسانہ پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ نگاہوں سے تحریر جوں جوں گزر رہی تھی میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ تم وہی دیبا ہو، جس نے میرے دل کا چین اور راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ جس کی یاد نے مر مر کے جینے پر مجبور کر رکھا ہے۔ جس نے میرا سکھ اور چین سب کچھ لوٹ لیا ہے۔ ہاں! سب کچھ! دیبا! سب کچھ۔!

اے روحِ رواں! تم کہاں کھو گئی تھیں! کیا کسی اجنبی دنیا میں جا کر بس گئی تھیں؟ میں نے تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈا کہاں کہاں پکارا، مگر تم مجھے نظر نہ آئیں! تمہاری جستجو نے مجھے ایسا تھکایا کہ اب میں پاگل سا ہو گیا ہوں۔ ہاں دیبا! پاگل، بالکل پاگل! میرے دوست احباب مجھے اب فرہاد کہہ کر مخاطب کرتے

ہیں۔

اچھا یہ تو بتاؤ، تم روٹھ کر کہاں چلی گئی تھیں۔ میں نے ایسا کونسا قصور کیا تھا جس کی اتنی بڑی سزا تم نے میرے لیے تجویز کی! دیبا کہیں ایسا تو نہیں .....مگر..... نہیں، نہیں! تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ تم بدل نہیں سکتیں! تم میری ہو، میری! آج بھی تمہارے دل میں صرف میری محبت بسی ہوئی ہے۔ اسی لیے تو تمہارے اس افسانے "ہاتھ کی ٹیڑھی لکیر" کی ہر سطر میں ایک درد، ایک کرب اور ایک نہ ختم ہونے والی تڑپ پوشیدہ ہے، جو مجھے نظر آرہی ہے لیکن ایسا معلوم ہورہا ہے کہ تم اب تک مجھ سے بدگمان ہو۔ جب ہی تو تم نے لکھا ہے کہ "مرد بے وفا ہوتے ہیں۔ اپنی محبت کا جھوٹا ناٹک رچا کر نہ جانے کہاں روپوش ہوجاتے ہیں اور عورت! آہ ــ بے چاری، درد کی ماری در در بھٹک کر صبر کے دامن میں پناہ لیتی ہے اور خاموشی سے اپنے درد کا مداوا ڈھونڈتی پھرتی ہے مگر کیا عورت کے درد کا درماں اس دنیا میں مل جاتا ہے۔ ؟!"

"دیبا ڈارلنگ!....."

اتنا پڑھ کر جیسے دیبا کا سر چکرانے لگا۔ نفرت کے جذبے نے اُسے سرتاپا غم وغصہ میں ڈبو دیا۔ وہ اپنی اس عجیب سی کیفیت کی وجہ سے پُورا خط بھی نہ پڑھ سکی۔ اس کی نگاہ غیر اختیاری طور پر نیچے لکھے ہوئے نام کی طرف گئی

"آج بھی تمہارا"

"فریدی (لندن)"

وہ یہ نام دیکھ کر حواس باختہ ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سارا جسم ایک دم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے وہ

کرسی سے اٹھی اور فریج کے قریب پہنچ کر اس نے فریج کھولا اور بوتل سے
گلاس میں ٹھنڈا پانی اونڈیلا اور ایک ہی سانس میں گلاس کا سارا پانی پی
گئی۔ اُسے اب یہ سارے نظارے پھیکے پھیکے سے نظر آنے لگے۔ سائبان
تلے کے گملوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی جاذبیت اُسے اب متأثر نہیں کر رہی
تھی۔ اس کے جسم سے مس ہوتے ہوئے معطر ہواؤں کے خوش گوار
جھونکے اُسے کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ پھولوں کی مسکراہٹ دیکھ کر اُسے
طنز کا سا احساس ہوا۔ سبزہ اپنی شادابی اور دل کشی دکھا کر اُسے جلا رہا ہے
وہ بے اختیار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر زار و قطار رونے
لگی.....!

چند ساعت پہلے وہ سرور و کیفیت سے سرشار تھی، مگر اب وہ
پیکرِ غم بنی ہوئی کراہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ پاس رکھی ہوئی آرام
کرسی پر دراز ہو گئی۔ اس کا پریشان ذہن ماضی کے دریچوں میں کسی کی
جستجو کرنے لگا۔ اب وہ بڑی بے تاب تھی اور بہت مضطرب نظر آ رہی تھی۔

فریدی اور دیبا دونوں کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور
دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ جب ان کی محبت
نے اس منزل میں قدم رکھا جہاں جدائی کا ایک لمحہ بھی ناقابلِ برداشت ہوتا
ہے تو فریدی نے ایک دن جی کڑا کر کے اپنے ڈیڈی سے اپنے دل کی بات
کہہ دی کہ وہ دیبا سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سُن کر فریدی کے ڈیڈی نے
کہا کہ تم لندن جا کر پہلے وہاں کے کاروبار کو سنبھالو، اگر تم نے اس مہم کو
سر کر لیا تو دیبا جیسی غریب گھرانے کی لڑکی سے تمہاری شادی کر دینگے

مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

اسی کے ساتھ دیبا اور اس کی بوڑھی اور بیمار ماں سے کہ کر انھیں دوسری جگہ جانے پر مجبور کر دیا کہ فریدی نے شادی کر لی ہے اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ لندن پرواز کر گیا ہے۔

فریدی کو اپنے ڈیڈی کی چال بازی کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ محبت کا مارا اپنی محبوبہ کو پانے کی خاطر سنگلاخ پہاڑ کو کھود کر جوئے شیر بھی نکال سکتا تھا یہ تو کچھ دنوں کی جدائی تھی۔ وہ خوشی خوشی دیبا کو یہ خوش خبری سنانے اس کے گھر گیا تو دیبا کا گھر مقفل دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ اس نے دیبا کو بہت تلاش کیا۔ بہت ڈھونڈا لیکن دیبا کا کہیں کوئی پتہ نہ چلا جس سے وہ دل گیر ہو گیا۔ اس کے سفر پر جانے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ مجبوراً وہ دل گرفتہ لندن چلا گیا اس آس پر کہ دیبا کہیں اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں گئی ہوگی، واپس آجائے گی۔

ادھر دیبا بیچاری درد کی ماری در در بھٹکتی رہی۔ غربت کی ہلی ٹھوکریں کھاتی رہی۔ اپنی بیمار بوڑھی ماں کا نازک سہارا بنی رہی۔ آخر کار قدرت کو اس پر رحم آ گیا اور اسے ایک نسوانی کالج میں ملازمت مل گئی۔

وقت گزرتا رہا۔ ساتھ ساتھ دل کے گہرے زخم بھی آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگے۔ کالج کا ماحول دیبا کو ایک طرح سے راس آ گیا تھا۔ اس کے اخلاق اور حسنِ سلوک نے کالج کی طالبات کے علاوہ پروفیسروں کا دل بھی موہ لیا تھا۔

دیبا کی ایک شاگرد عالیہ تھی جو دیبا کو دل و جان سے عزیز رکھتی تھی۔ دیبا بھی اسے بہت چاہتی تھی۔

ایک دن عالیہ کی سال گرہ تھی۔ اس محفل میں دیبا نے جاوید کو دیکھا۔ جاوید عالیہ کا بڑا بھائی تھا۔ جاوید ایر انڈیا کا ایک ہونہار پائلٹ تھا۔ وہ بہت خوب صورت اور وجیہہ بھی تھا۔ پہلی ہی نظر میں جاوید کو دیبا کی سادگی اور سنجیدگی کے منفرد انداز نے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ اس پہ ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔

دیبا کو جاوید کے احساسات وجذبات کا بالکل علم نہ تھا۔ اس کا دل ان احساسات سے بالکل عاری ہو چکا تھا۔ لیکن جاوید کی محبت جو ایک حقیقت بن چکی تھی اس کا اثر ہو کے رہا۔ اس مہم میں عالیہ نے نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ وہ دیبا کو کسی طرح اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ قدرت نے بھی مدد کی۔ بالآخر دیبا اور جاوید ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گئے۔

دیبا جاوید کی زندگی میں بہار بن کر داخل ہو گئی۔ اس رنگین دنیا میں دونوں کے پانچ سال دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔ عالیہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے ماموں کے پاس لندن چلی گئی۔ دیبا بالکل تنہا رہ گئی۔ جاوید ہفتہ عشرہ کے بعد غیر ممالک جاتا اور پندرہ دنوں کے بعد واپس آجاتا اور دیبا کے پاس پہنچ کر سکون کی سانس لیتا۔ دیبا کو جاوید کی عارضی عدم موجودگی بھی شدت سے گراں گزرتی تھی۔ اپنی تنہائی کو خوش گواری سے بسر کرنے کے لیے اس نے قلم کا سہارا لیا۔ جاوید اس کی ادبی صلاحیت سے بے حد متاثر ہوا۔ اسی کے اصرار پہ دیبا اپنی تخلیقات ملک کے مقتدر رسالوں میں اشاعت کے لیے روانہ کرنے لگی۔ آج اس کی پہلی کاوش کا پہلا اور خوش گوار نتیجہ اس کے سامنے تھا۔ وہ بہت خوش تھی لیکن اس کی شادمانی کی دنیا میں اچانک بادِ خزاں کا ایک

زبردست جھونکا آیا وہ یہ دیکھ کر کراہ اٹھی اور وہ ماضی کی دنیا میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک ایک مانوس آواز کو سن کر وہ چونک پڑی۔ جلدی سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اپنی بھیگی پلکوں کو صاف کیا۔

"ہیلو ڈارلنگ! ہاؤ آر یو! یہ خوش گوار فضا بتا رہی ہے کہ دیبا ڈارلنگ کی تنہائی نے قوسِ قزح کے رنگوں کی طرح دل نواز جلوے دکھائے ہیں۔"

"ارے آپ! کب آئے؟ فون تو کر دیا ہوتا!"

جاوید کو دیکھ کر دیبا کا غم میں ڈوبا ہوا چہرہ ایک دم گلنار ہو گیا۔

"اب میں کبھی فون نہیں کروں گا! تم اب بین الاقوامی ادیبہ بن گئی ہو۔ کیا معلوم تم کس وقت کسی رومانی اور جذباتی پلاٹ میں کھوئی ہوئی ہوگی، ایسے موقع پہ فون کی گھنٹی بھی تمہارے تخیلات کا کیا عجب کہ شیرازہ منتشر کر دے۔"

"نہیں جاوید! اس طرح مجھے آسمانوں کی بلندی پہ نہ چڑھاؤ۔ ورنہ میں اتنی ہی تیزی سے نیچے آ گروں گی!"

"نو ڈارلنگ نو! بالکل نہیں! تمہارا ستارہ اب پورے عروج پہ ہے۔"

دیبا کو جیسے سب کچھ مل گیا۔ اپنے شریکِ حیات کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ایک کلی کی طرح وہ کھل اٹھی۔

ٹیبل پہ بکھرے ہوئے سارے خطوط کو دیکھ کر جاوید نے بھی اپنے کوٹ کی جیب سے ایک خط نکالا اور دیبا کو دیتے ہوئے بولا

"یہ لو دیبا ڈیر! تمہاری بے پناہ مقبولیت کی شہادت میں ایک

اور خط!" یہ کہتے ہوئے جاوید اندر کمرے میں چلا گیا۔ اور دیبا بے چینی سے خط کھول کر پڑھنے لگی۔

مائی ڈیر بھابی!

آپ نے تو کمال کر دیا۔ اللہ اللہ! آپ نے ایسا افسانہ لکھ دیا ہے جو میرے دل میں اتر گیا۔ اپنی پہلی اور اچھوتی تخلیق پر یقیناً مبارک باد کی مستحق ہیں!

بھابی ڈیر! یقین جانیے اگر میں آپ کے قریب ہوتی تو آپ کے ہاتھ اور آپ کے سحر آفریں قلم کو چوم لیتی۔ جو دل کل تک محبت کے جذبات سے ناآشنا تھا آپ نے اُسے اپنی سحر انگیز تحریروں سے محبت کے سب آداب سکھا دیئے۔ اب کچھ نہ پوچھئے! اب تو دل بہکا جا رہا ہے۔ اس کی رہ نمائی بھی صحیح سمت میں اب آپ ہی کو کرنا پڑے گی! ....

ڈارلنگ بھابی! آپ ایک اچھی اور کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ ایک افسانہ نگار نفسیاتی پہلو پر زیادہ توجہ دیتا ہے اور پھر محبت تو گویا ایک طرح کی عبادت ہی ہے۔ آپ ہی نے تو لکھا ہے!

مجھے آپ لوگوں کا طے کیا ہوا رشتہ بالکل پسند نہیں ہے۔ یہاں کسی اور کی آمد آمد میرے دل کی دنیا میں بہار لے آئی ہے۔ انہیں میں کب سے ذہنی طور پر قریب قریب اپنا شریکِ حیات بنا چکی ہوں۔ ان کا ذکر میں پہلے خط میں بھی اچھی طرح کر چکی ہوں۔ معلوم نہیں کیوں ان کی سنجیدگی اور متانت نے میرے دل کو موہ لیا ہے اور میری گرویدگی آئے دن ان سے بڑھتی ہی جا رہی ہے۔"

اتنا ہی پڑھ پائی تھی کہ جاوید کی آواز آئی۔ دیبا کی توجہ خط کی طرف سے

ہٹ کر جاوید پر مرکوز ہوگئی دونوں باتوں میں مصروف ہوگئے۔ اور اسی طرح پتہ نہیں چلا کہ کب اور کیسے دس دنوں کے رات دن بیت گئے۔ اس عرصہ میں دیبا نے ایک دن عالیہ کے خط کا ذکر بھی کر ڈالا۔ جاوید کو عالیہ کی اس اپنی پسند پر کوئی اعتراض نہ ہوا......

دس دنوں کے بعد جاوید اپنی ڈیوٹی پر غیر ممالک چلا گیا۔ دیبا تنہا رہ گئی۔ اُسے یہ خدشہ مستقل رہ رہ کر ہونے لگا کہ کون جانے کب فریدی آکر اس کی دنیا میں کوئی ہنگامہ برپا کردے۔

بالآخر ایک دن اس کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ فریدی طوفان کی طرح آیا اور طوفان کی طرح چلا گیا.... لیکن جاتے جاتے وہ دیبا کے حساس دِل کو مجروح کرتا گیا۔

"مرد کو بے وفا کہنے والی عورت خود کتنی بے وفا ہوتی ہے کیا تم نے کبھی یوں بھی سوچا ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ عالیہ کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے۔ مگر اب رشتے کا بھی بخوبی علم ہوگیا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ تم کس طرح اپنی جھوٹی محبت کے جال میں کسی مرد کو اپنے قابو میں کر لینے کی قابلیت رکھتی ہو۔ لیکن اب تمہارا یہ ناٹک بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ اب میں نے عالیہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور میرا یہ فیصلہ تمہارے دن کا سکھ اور راتوں کی نیندیں حرام کردے گا۔"

یہ کہتے ہوئے فریدی ایک دم سے باہر نکل گیا۔ دیبا کی خوش گوار اور مطمئن دنیا پر غموں کے بادل چھا گئے۔ وہ چیخ چیخ کر یہ کہنا چاہتی تھی کہ فریدی تم مجھے کیوں بے وفا اور قصوروار قرار دیتے ہو۔ اپنے ڈیڈی سے تو ایک

بار پوچھ لیا ہوتا، جنہوں نے تمہارے بارے میں غلط بیانی کر کے مجھے فریب دیا۔
مجھ سے یہ کہا گیا کہ تم نے شادی کر لی ہے۔ یہ سننے کے بعد میرے دل پہ کیا گذری
یہ بھی کبھی تم نے سوچا!"

لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی! صرف اس کی غمناک آنکھیں بہت
دیر تک اپنی بے بسی پہ آنسو برساتی رہیں! اب وہ بہت زیادہ غم زدہ رہنے
لگی تھی۔

ایک دن اچانک عالیہ بھی آپہنچی۔ زخم پہ دوسری زبردست
ضرب لگی۔ لیکن وہ اندر ہی اندر برداشت کرتی رہی۔

فریدی عالیہ کے آنے کے بعد ہر روز عالیہ سے ملنے دیبا کے گھر آنے
لگا اور عالیہ کے ساتھ وقت گزار کر اُسے تڑپانے اور جلانے لگا۔

کچھ دنوں کے بعد جاوید بھی آپہنچا۔ عالیہ اور فریدی کا رشتہ طے
ہو گیا۔ اس خوشی میں جاوید نے ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا لیکن اچانک
ایک صبح فریدی کا خط جاوید کے نام آیا۔

"جاوید صاحب!

میں نے سمجھا تھا کہ عالیہ کو اپنا کر میں اپنے ماضی کو بھول جاؤں گا۔
میں اپنی اس کوشش میں ناکام رہا۔ میری پہلی ناکامی محبت کے درد کو کم نہ کر سکا
میں نہیں چاہتا کہ آپ کو اور عالیہ کو دھوکہ میں رکھ کر اپنے ضمیر کو پستی میں گرادوں۔

میں جا رہا ہوں، وہاں جہاں میرا ماضی میرا پیچھا نہ کرے، وہ ماضی
جس کے یادوں کے سہارے میں جی رہا تھا۔ بلکہ جینا چاہتا تھا۔ لیکن میرے
ماضی کے وہ خواب شیریں میری بدقسمتی سے اب تلخیوں میں بدل گئے ہیں۔ ان

یادوں کی کسک میرے لیے اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ اب میں اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں۔ میری نامرادی خار بن کر میرے دل میں چبھ رہی ہے۔ وہی خار اب مسکرا مسکرا کر مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ

"گُل جب کِھلتے ہیں تو خار مُسکراتے ہیں"!

فریدی"

خط کا مضمون پڑھ کر جاوید عالیہ کی طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ عالیہ یہ سُن کر بہت غمگین اور ملول ہو گئی۔

مگر دیبا کے پلکوں پہ آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے چمکنے لگے۔ یہ قطرے کن جذبات و احساسات کے غماز تھے؟ کیا فریدی کی بیمثال شخصیت کے، اس کی لازوال وفاداری کے یا فریدی کی دائمی بربادی کی ترجمانی کر رہے تھے۔ دیبا میں خود بھی یہ راز سمجھنے کی صلاحیت باقی نہ تھی!!

••

۳ر دسمبر سنہ ۱۹۸۴ء

مدراس

محترمی خان بھائی صاحب !

تسلیمات !

امید ہے آپ بعافیت ہوں گے ......! پچھلے دوماہ کے شمارے موصول نہیں ہوئے ...... یہ تاخیر ادارے کی جانب سے ہو رہی ہے یا ڈاک کی طرف سے .....! میں نے اپنے گزشتہ خط میں بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ مگر آپ نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہیں لکھا، بس اتنا ہی لکھا ہے کہ "رسالے ارسال کئے جا چکے ہیں۔"

"دختران اسلام لے کارنامے" قارئین پسند فرما رہے ہیں، یہ معلوم کر کے روحانی مسرت ہوئی۔ گزشتہ ہفتہ دو اور مضامین روانہ کر چکی ہوں امید ہے کہ اب تک وہ آپ کو مل چکے ہوں گے۔

"دخترانِ اسلام کے کارنامے" ماہِ نومبر سنہ ۱۹۸۲ء سے شائع ہو رہے ہیں۔ اب تک پورے بارہ ۱۲ مضامین "روشن ادب" میں آچکے ہیں آپ نے لکھا ہے کہ چھ ۶ اور مضامین کے بعد یہ سلسلہ بند کر دیا جائے گا۔ اور تمام مضامین کو ایک کتابی شکل میں ترتیب دی جائے گی۔ یہ جان کر خوشی

ہوی۔ مگر یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ گرانی کی وجہ سے رسالہ "روشن ادب" کی طباعت میں دقتیں پیش آرہی ہیں۔ آپ دل تھوڑا نہ کریں۔ یہ نیک کام عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور آپ ادب کے ذریعہ سماج کی اصلاح و بہبودی کا کام کر رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

بہرحال!..... لیجیے "بس اسٹاپ" حاضر ہے۔

کچھ لوگ اتنے ناسمجھ ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں پر انگلیاں اٹھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کر رہے ہیں۔ مگر بعد میں جب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو وہ پشیمان بھی ہوتے ہیں اور پچھتاتے بھی ہیں.....!

"بس اسٹاپ" کی ہیروئن حالات کے دیے ہوئے دکھوں اور غموں کی بری طرح شکار ہے....... مگر دیکھنے والے اسے کچھ اور ہی سمجھتے ہیں.....!

نیازمند

صبا جائسی!

بس اسٹاپ

کارخانے کے کیفے میں کافی پیتے ہوئے موہن نے اپنے دوست دیپک سے کہا :

"یار دیپک ! میں تم سے بطور راز کچھ کہنا چاہتا ہوں، مگر سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کیسے کہوں ... !"

دیپک نے کافی پیتے ہوئے حیرت سے موہن کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو ؟ کہتے کیوں نہیں .. !"

"یار کیا بتاؤں ایک زبردست مسئلہ ہے، جس کا حل تلاش کر رہا ہوں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ تم اس سلسلے میں میری پوری مدد کروگے۔"

"ہاں ہاں! ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن تم پہلے مسئلہ تو بیان کرو۔"

"سوچ رہا ہوں کہ بات کو کس طرح اور کہاں سے شروع کروں۔"

"ارے دوست! جو کچھ کہنا ہے کہ ڈالو، سوچنا بعد میں ورنہ کارخانے کی گھنٹی بج گئی تو پھر تمہاری بات ادھوری رہ جائے گی، اور تم سوچتے ہی رہ جاؤگے۔"

"بات دراصل یہ ہے دیپک کہ ایک لڑکی ہے، بڑی خوبصورت، معصوم اور نادان سی جو اکثر مجھے بس اسٹاپ پر مل جاتی ہے۔ بس اسٹاپ پر ہر قسم

کے بہت سے لوگ موجود ہوتے ہیں لیکن اس کی دونوں معصوم نگاہیں صرف مجھی پر ہی جمی رہتی ہیں۔"

"تم بہت حسین ہو نا اس لیے۔" دیپک نے قطع کلام کرتے ہوئے طنز یہ فقرہ چست کیا۔

"ارے سنو بھی یار، کیوں موڈ خراب کرتے ہو۔ بہت دنوں کے بعد تو میں اپنے آپ کو سنبھال کر تم سے کہہ رہا ہوں اور تم ہو کہ مذاق اڑانے پر تلے ہوئے ہو۔"

"اچھا کہو بابا کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"ہاں! تو میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اس کی معصوم سی نگاہیں مجھ پر ہی جمی رہتی ہیں۔ میں اس کے اس تیکھے انداز پر تڑپ جاتا ہوں، کیا بتاؤں دوست ان نگاہوں میں کس غضب کی دل کشی اور دل آویزی ہوتی ہے، بس میرا ہی دل جانتا ہے۔"

"اچھا اب سمجھ میں آیا، بس اسٹاپ پر ملنے والی بڑی پیاری سی اس لڑکی کی داستان ہے، جسے تم کہتے ہوئے شرما رہے تھے، یہی نا!"

"ہاں ہاں دوست! کیسے نہ گھبراتا، بات ہی ایسی ہے، گھر پر دھرم پتنی کو اگر یہ راز کسی طرح معلوم ہو گیا تو میری زندگی کے لالے پڑ جائیں گے۔ اور وہ مجھے منہ دکھانے کے لائق نہ رکھے گی۔"

"ارے بھئی! دھرم پتنی کو کیوں معلوم ہونے لگا۔ تم چپکے چپکے بس اسٹانڈ پر عشق لڑاتے رہو اور گھر پر دھرم پتنی کو دھرم کے کاموں میں مصروف رکھو۔"

"عشق وشق کیسا یار! وہ لڑکی تو مجھے بالکل پاگل سی معلوم ہوتی ہے۔"

"ابھی ابھی تو تم اس کے حسن و جمال کی دل کھول کر تعریف کر رہے تھے اور اب اسی منہ سے اسے پاگل کہہ رہے ہو۔ مجھے تو تمہارے دماغ کی صحت پر شبہ ہونے لگا

ہے۔"

"پاگل نہیں تو اور کیا کہوں یار! کبھی کبھی اس قدر محویت کے عالم میں مجھے دیکھتی ہے کہ اس کی وہ بس بھی گزر جاتی ہے۔ جس پر اُسے جانا ہے اور اسے ہوش تک نہیں رہتا۔ اور کبھی کبھی مجھے دیکھ کر ایسی انجان بن جاتی ہے کہ جیسے پہلے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کل بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔"

دیپک موہن کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر پوچھا:

"وہ کب سے تمہارے عشق کی مریض ہے؟"

"یہی کوئی پانچ چھ ماہ ہوئے ہوں گے۔"

"اور تم نے مجھے اب بتایا، جب تمہیں ملنے کی کوئی تدبیر نہ بن پڑی۔"

موہن نے چیخ کر کہا۔

"ارے یار کیوں مخواہ بے چاری معصوم لڑکی کو بدنام کرتے ہو، البتہ اس سلسلہ میں تم مجھے کوئی صائب مشورہ دوستانہ طور پر تو دے سکتے ہو!"

"کس قسم کی رائے؟ ملاقات کی، چاندنی رات کی؟ یا بارات کی!"

دیپک نے موہن کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

موہن نے قدرے برہمی کے ساتھ کہا:

"توبہ یار! تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ میں تم سے دوستانہ رائے اور مشورہ کا طالب ہوں اور تم ہو کہ میرا مذاق اڑا کر وقت برباد کر رہے ہو۔" موہن کچھ دیر رُکا ایک گہری سانس لی اور پھر دیپک کی طرف انکساری کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا

"دیکھو دیپک! میں تم سے اتنی مدد چاہتا ہوں کہ کسی روز ہم دونوں اس کے گھر جائیں اور اس نادان کو سمجھائیں کہ بس اسٹانڈ پر کسی غیر مرد کو مستقل اس طرح گھور کر دیکھنا

اور تکنا کوئی اچھی عادت نہیں کہی جا سکتی۔ دوسرے لوگ اس طرح دیکھنے کو کس نظر سے دیکھیں گے اور کیا گمان کریں گے۔"

دیپک نے اپنے دوست موہن کی طرف غور سے دیکھا اور ہنستے ہوئے بولا۔" تمہارا مطلب میں اب سمجھا۔ یعنی تمہارا مطلب بس اسٹاپ پبلک جگہ ہے پرائیوٹ کام کے لیے کسی دوسری جگہ کا انتخاب ہونا چاہیئے۔"

موہن دیپک کے ان جملوں کی تاب نہ لاکر غصّے کا اظہار کرنے لگا۔" پھر تم وہی پاگلوں جیسی باتیں کرتے ہو۔ دیپک تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے صاف صاف کہہ دیں کہ میرے ساتھ تمہارا یہ مخصوص انداز نہ تمہیں زیب دیتا ہے نہ میرے لیے زیبا ہے۔ میں بہرحال شادی شدہ ہوں اور دو بچّوں کا باپ بھی ہوں!"

دیپک موہن کے ان جملوں کو سُن کر مجسم حیرت بنا اسے بہت دیر تک دیکھتا رہا اور پھر فوراً بول پڑا۔

"ارے موہن جی! تم اتنے پاکباز اور شریف آدمی ہو، اس کا علم مجھے آج سے پہلے نہیں تھا۔ ہاں! تمہارے چہرے سے تو شرافت ظاہر ہوا کرتی تھی، لیکن آج تمہاری دلی کیفیت، اندازِ فکر اور کیریکٹر کا اندازہ بھی بخوبی ہوگیا۔"

دیپک پھر کچھ سوچ کر بولا۔

" اچھا یار! تمہیں یہ پتہ ہے کہ وہ رہتی کہاں ہے؟"

"ہاں! میں جانتا ہوں! وہ گرلز اسکول میں پڑھاتی ہے اور اسی بس اسٹاپ کے قریب سیون ویسٹ اد، بس رہتی ہے۔"

"ایسے پھر نیک کام میں دیر کیسی دوست! آج ہی شام کو وقت نکال کر اس کے گھر چلتے ہیں۔"

پروگرام کے مطابق دونوں بس والی لڑکی کے گھر کی طرف چل دیے
اس کے دروازے کے قریب پہنچ کر موہن نے گھنٹی بجائی ___ گھنٹی بجتے ہی
اندر کمرے سے ایک نحیف سی آواز آئی۔

"کون ہے بھئی اندر چلے آؤ۔"

موہن اور دیپک آہستہ سے اندر کمرے میں داخل ہو گئے۔ دائیں طرف
پلنگ پر انھیں ایک بیمار اور کمزور سا بوڑھا شخص لیٹا ہوا نظر آیا۔
موہن اور دیپک کے ہاتھ انھیں دیکھ کر خود بخود نمستے کے لیے اٹھے۔
بوڑھے شخص نے نمستے کا جواب بڑے تپاک اور خلوص سے دیا اور انھیں ایک طرف
رکھی ہوی کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا، دونوں اس کی بتائی ہوی کرسیوں پر
بیٹھ گئے اور کنکھیوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگے۔

"تم لوگ کون ہو؟ میں نے تمھیں نہیں پہچانا، نہ اس سے پہلے کبھی
دیکھا تھا۔"

دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ پھر موہن نے
گھبراتے اور ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"جی! آپ کی بیٹی سے ذرا ہمیں ملنا ہے۔"

بوڑھے نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر کہا۔

"اوہ! رما سے..... ؟ تم لوگ رما سے ملنا چاہتے ہو.....!"

"جی ہاں جی! ہم رما جی سے ملنا چاہتے ہیں"

"تم لوگ رما کو کیسے جانتے ہو؟"

"جی.. جی انکل! رما مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہیں۔ اکثر ہماری ملاقات

ہوتی رہتی ہے۔"

"اچھا اچھا! میں ابھی رما کو بلاتا ہوں۔"

بوڑھے شخص نے رما کو آواز دی! جب کچھ دیر تک اندر سے کوئی جواب نہیں ملا تو رما کے پتا نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شاید پڑوس کے گھر گئی ہوئی ہے ابھی آجائے گی۔ آپ لوگ آرام سے بیٹھیے۔ میں آپ لوگوں کی کسی قسم کی کوئی خاطر بھی نہیں کر سکتا۔ اپاہج ہوں۔ معذور ہوں۔"

"جی! ؟ اپاہج!" دونوں نے ایک زبان ہو کر حیرت سے کہا۔

"ہاں بیٹے! میری دونوں ٹانگیں نہیں ہیں۔ چھ مہینے قبل میں اپنے بیٹے رمیش کے ساتھ ریل گاڑی سے دہلی جارہا تھا۔ کہ اچانک رات کو ہماری ٹرین کے پہیئے پٹری سے اتر گئے اور ٹرین کے کچھ ڈبے ندی میں گر گئے بہت سے لوگ اس حادثے میں جاں بحق ہوئے۔ جو بچے وہ سب بھی کچھ نہ کچھ زخمی ہوئے۔ میرا بھی جوان اور اکلوتا بیٹا اسی حادثہ میں ہمیں چھوڑ کر دوسری دنیا کو چلا گیا۔۔۔ میری دونوں ٹانگیں بے کار ہو گئیں، لیکن میں بد نصیب زندہ ہوں۔ کاش میں بھی چلا جاتا تو کیسا اچھا ہوتا۔ اپاہج باپ کب تک جوان بیٹی کا سہارا بن سکتا ہے؟"

یہ کہتے ہوئے رما کے پتاجی اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔ اتنے میں رما باہر سے دوڑی ہوئی اندر آئی۔ کمرے میں موہن اور دیپک کو دیکھ کر وہ کچھ سہم سی گئی اور گھبرائی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ موہن بھی دیپک کو حیرت سے تکنے لگا۔

"رما بیٹی۔۔۔! ارے تم نے دیکھا نہیں! یہ دیکھو تم سے ملنے کون آئے ہوئے ہیں۔"

رما اندرونی کمرے سے نکل کر آہستہ آہستہ باہر آنے لگی۔ اس کی نگاہ موہن اور دیپک پر پڑی، اس نے انھیں دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا اور اپنے پتاجی کے پلنگ کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ رما کی خاموشی اور گھبراہٹ دیکھ کر اس کے پتاجی کو تعجب ہوا۔

"بیٹی رما! یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔"

"مجھ سے؟" رما نے حیرت زدہ ہو کر سوال کیا۔

"ہاں ہاں! تم سے بیٹی! اور کس سے۔"

"لیکن پتاجی میں تو انھیں بالکل نہیں جانتی!"

موہن یہ سن کر گھبرا گیا۔ اسے حیرت پر حیرت تھی کہ آخر یہ بات کیا ہے، آج تو جیسے ان تلوں میں تیل ہی نہیں ہے، پھر اس نے جرأت کر کے پوچھا

"رما جی! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں، آپ مجھے نہیں جانتیں! بس اسٹاپ پر ہر روز ہماری آپ سے ملاقات ہوتی رہی ہے۔"

"ملاقات....؟! میری! آپ سے....؟؟ نہیں تو...؟ کبھی نہیں.....!"

"آپ مذاق کر رہی ہیں، کل بھی تو بس اسٹانڈ پر ہماری ملاقات ہوی۔ جب آپ مجھے دیکھ رہی تھیں اور بس اسٹاپ پر موجود ہجوم مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے شرم محسوس ہوی۔ لیکن آپ مجھے دیکھنے میں اس قدر محو تھیں کہ آپ کی بس کل بھی چھوٹ گئی اور آپ کو خبر بھی نہ ہوی۔ جب آپ کو ہوش آیا تو آپ نے آٹو کو آواز دی.... یاد آیا..!"

رما ذہن پر زور دیتے ہوئے کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر یک لخت

چلّا کر بولی۔

"ہاں ہاں۔ ہاں پتاجی! کل میری بس چھوٹ گئی تھی۔" یہ کہہ کر وہ زار وقطار رونے لگی۔ موہن اور دیپک دونوں حیرت زدہ رہ گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"کیا ہوا بیٹی! تم رو کیوں رہی ہو۔ بس چھوٹ گئی تو کیا ہوا؟"
پھر رما کے پتاجی غم زدہ ہو کر کہنے لگے۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کبھی کبھی یہ اسی طرح کی حرکتیں کر بیٹھتی ہے، جب سے اس کا بھائی گذرا ہے اس کی یاد آتے ہی یہ یا تو کسی دوسری دنیا میں کھو جاتی ہے یا پھر زار وقطار رونے لگتی ہے۔"

"بس بس انکل! آپ درست فرما رہے ہیں۔ مجھے بھی رما جی کبھی کبھی بالکل نہیں پہچانتیں اور کبھی کبھی بالکل خاموش اور متحیّر گھورتی اور دیکھتی رہتی ہیں اور کبھی کبھی گم سم ہو جاتی ہیں، جیسا حال اس وقت بھی ہے۔"

رما موہن کی بات سن کر چیخ پڑی۔

"نہیں، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ تم لوگ کون ہو؟ مجھے کیا معلوم! میں تم لوگوں کو بالکل نہیں جانتی! ہاں پتاجی اتنا ضرور ہے کہ بس اسٹانڈ پر اکثر مجھے ایک شخص نظر آجاتا ہے۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں ماضی کی یادیں خود بخود تازہ ہو جاتی ہیں۔ ٹھہریئے میں ابھی آئی۔"

یہ کہتی ہوئی رما اندر کمرے میں گئی اور کچھ لمحے بعد جب وہ لوٹ کر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک رنگین لال اور سفید دھاری دار کپڑے کا بڑا سا ٹکڑا تھا۔

"پتاجی! یہ دیکھیے، اسی کپڑے کی بنی ہوی قمیص پہن کر ایک شخص اکثر بس اسٹاپ پر مجھے نظر آجاتا ہے۔ میری نظر جب کبھی اس کی شرٹ پر پڑ جاتی ہے میرا دل کانپنے اور تھر تھرانے لگتا ہے..... پتاجی! میرے جسم کے رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میں پھر..... پھر پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ پتاجی! اس کپڑے کے بنے شرٹ میں مجھے کوئی اور نہیں بلکہ مجھے میرا بھیّا نظر آتا ہے، آپ جانتے ہیں کیوں مجھ پر ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اسی کپڑے کی بنی ہوی قمیص پہن کر بھیّا آپ کے ساتھ سفر پر نکلے تھے۔ جب واپس آئے تو گھر پر نہیں بلکہ مردہ گھر میں! اسی کپڑے کی بنی شرٹ میں میں نے اپنے بھیّا کی لاش مردہ گھر میں دیکھی تھی۔ ہاں پتاجی! میں نے اسی کپڑے کی بنی شرٹ میں اپنے بھیّا کی لاش دیکھی تھی۔"

وہ پاگلوں کی طرح پھوٹ کر رونے چلانے لگی۔

یہ جان کر کے موہن اور دیپک ایک دوسرے کو مبہوت نظروں سے دیکھتے رہ گئے۔ ••

۱۷ر دسمبر سنہ ۱۹۸۵ء

مدراس

محترم توفیق بھائی صاحب!

السلام علیکم۔

امید ہے آپ عافیت سے ہوں گے.....! کیپٹن صاحب کل فلائیٹ لے کر دہلی پہنچ گئے ہیں۔ آج صبح ہی ان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ کئی بار انھوں نے آپ کا نمبر ملایا، گھنٹی بج رہی تھی مگر کوئی رسیور اٹھا نہیں رہا تھا۔ شاید فون خراب ہو یا آفس میں کوئی نہ ہو——! بہرحال.....! وہ پھر کوشش کریں گے۔ اگر فون لگ گیا تو بہتر ورنہ دوسری بار جب پھر دہلی جائیں گے تو ملاقات کر لیں گے...!

میں نے اپنے گذشتہ خط میں اردو کے مستقبل کے بارے میں اپنی بے پناہ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اردو کا مستقبل بھیانک ہو......! آپ کا جواب اس سلسلہ میں مجھے دو دن قبل ملا۔ جس میں آپ نے میری تشویش کو کم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " اردو ایک شان دار، جان دار، شیریں اور شائستہ اور ہر دلعزیز زبان ہے۔ جو ہندوستان کی سرزمین کی دین ہے۔ جس میں پورے کا پورا

ہندوستان سمایا ہوا ہے۔ یا یوں کہیئے کہ اردو میں ہندوستان کی رُوح بسی ہوئی ہے۔ پھر آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اردو کا مستقبل ہندوستان میں بھیانک ہو سکتا ہے۔"

آپ کے ان جملوں سے اس قدر بھر پُور اعتماد، یقین اور سچّائی جھلک رہی ہے کہ میں ایک حد تک مطمئن ہو گئی ہوں۔ مگر پھر بھی میں یہاں اس سلسلہ میں کچھ کہنا چاہوں گی وہ جو میرے مشاہدات ہیں۔ تجربات و احساسات ہیں، جو میں نے دیکھا ہے، سمجھا ہے، پرکھا ہے اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں، محسوس کر رہے ہیں۔ اور سمجھ رہے ہیں۔ کہ آج والدین اپنے بچّوں کو اردو کی تعلیم کی طرف نہ تو کوئی رغبت دلا رہے ہیں اور نہ ہی ان میں اردو پڑھنے کی دلچسپیاں پیدا کرنے کے ذرائع مہیا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی نسلیں اردو زبان سے دُور ہوتی جا رہی ہیں۔ کم از کم مسلمان والدین کو تو اردو کی تعلیم سے اپنے بچّوں کو بے بہرہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ قرآنِ شریف کے ترجمے اردو میں ہیں، تفسیریں اور دعائیں، تبلیغی نصاب احادیث اور شریعت کے سارے اصول، مسائل، قاعدے اور قانون، دلیلیں اور فتوے یہ سب اردو زبان ہی میں لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں۔ ان سب سے وہی فیض یاب ہو سکتے ہیں جو اس زبان سے واقف ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ آج کل دوسری زبانوں میں بھی مذکورہ بالا موضوعات پر کتابیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں، مگر اردو زبان میں مفہوم جس قدر آسانی اور خوب صورتی کے ساتھ

سمجھے اور سمجھائے جا سکتے ہیں' اتنی خوب صورتی، آسانی اور دل چسپی
کسی دوسری زبان میں پیدا نہیں ہو سکتی! یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنا
خدشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل اردو کی کتابوں کو پڑھنے والا ہی
کوئی نہ ہو......! اگر ایسا ہوا تو اردو کی روح تڑپ کر رہ جائے گی
..... میں اپنی سرکار سے اپنی طرف سے اور اردو پڑھنے والوں اور
اردو سے محبت رکھنے والوں کی طرف سے گزارش کرتی ہوں کہ اردو
زبان کی بقاء اور ترقی کے لیے کوئی ٹھوس، مضبوط اور مناسب قدم
اٹھائے تاکہ ہندوستان کی سیرزمین میں پیدا ہوئی اور پرورش
پائی زبان، نئی نسلوں کے ہاتھوں تباہ و برباد نہ ہو جائے......
اس سلسلہ میں آپ کی کوشش قابلِ تحسین ہے اور امید ہے کہ
اس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جائے گا۔ اس طرح کے اور بھی کئی
رسالے اردو کے آپ اپنے ادارے سے نکال سکتے ہیں۔ چوں کہ آپ
اردو کے محسن ہیں۔ آپ کے قدم بڑھتے دیکھ کر دوسرے بھی آپ
کے پیچھے پیچھے چلے آئیں گے.....! اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا
ہے.....!

مسز اندرا گاندھی پر میں نے جو کتاب لکھنے کا ارادہ کیا
تھا اس کے بارے میں آپ نے دریافت کیا ہے......! بھائی صاحب.
کیا عرض کروں! اب تو یہ ارادہ دن بدن اور مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔
ان پر قلم اٹھانے سے پہلے میں مختلف کتابوں کا جو مسز گاندھی پر
لکھی گئی ہیں مطالعہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں....! مطالعہ میں کوئی

چار پانچ مہینے تو لگ ہی جائیں گے اور لکھنے میں تقریباً اتنا ہی عرصہ لگ جائے گا۔ اور پھر یہی کوئی اگلے سال کے اواخیر تک کتاب انشاءاللہ تعالیٰ مکمل کرلوں گی۔ اس کے بعد ہی کتاب کے ساتھ دہلی آؤں گی۔ میری یہی کوشش رہے گی کہ جواہر لال نہرو میموریل ٹرسٹ یا پھر اندرا گاندھی میموریل ٹرسٹ کے ذریعہ کتاب شائع ہو جائے۔ کتاب کے مکمل ہونے کے بعد ہی فیصلہ ہوگا۔ اور کوشش کی جائے گی۔ ابھی سے کسی نتیجہ پر پہنچنا میرے خیال میں بے کار ہی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کی رائے بھی جاننا چاہوں گی.....!

بہرکیف...! ان پانچ چھ برسوں میں رسالہ "خاتون مشرق" میں میرے تقریباً سترہ اٹھارہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ مگر جب میں نے اپنے شائع شدہ افسانوں کی تعداد معلوم کرنے کے لیے "خاتونِ مشرق" کی چھان بین کی تو مجھے صرف چند ہی ماہ کے رسالے دستیاب ہوئے۔ جن میں میرے افسانے تھے۔ باقی کے سارے رسالے غائب تھے۔ دراصل میرے دوست واحباب اور ملاقاتی وہ رسالے جن میں میرے افسانے ہوتے ہیں پڑھنے کے لیے لے جاتے ہیں، یہ وعدہ کرکے کہ پڑھ کر واپس کردیں گے۔ مگر وہ کبھی واپس نہیں کرتے.....! اس لیے اب جب بھی مہمان میرے گھر آتے ہیں اور رسالے یا کتابوں کی فرمائش کرتے ہیں تو میں بہت سوچ وچار میں مبتلا ہو جاتی ہوں...... آج کل میں نے ایک سہل راستہ نکال لیا ہے، وہ یہ کہ میں نے اپنی لائبریری میں کتابوں کے شیلف کے اوپر

جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے ....

"کتابیں گھر لے جانا منع ہے۔"

یہ سختی میں نے اس لیے برتی کہ ایک دن میں نے دیکھا کہ میرے پڑوس کی ایک بچّی اپنے ہاتھوں میں ایک پیکٹ پکڑے لیے جارہی ہے۔ وہ پیکٹ کسی اردو رسالے کے ورق میں لپٹی ہوئی تھی۔ مجھے دُور سے ایسا لگا کہ اوپر کے ورق میں میری تصویر ہے۔ میں نے اس بچّی کو آواز دی اور اپنے قریب بلایا اور پیکٹ کو جب دیکھا تو وہ سچ مچ "خاتونِ مشرق" کے اوراق میں لپٹی ہوئی تھی۔ جس میں میری تصویر کے ساتھ افسانہ "انتقام" بھی نظر آیا۔ مگر آدھا افسانہ غائب تھا۔ یعنی آدھے ورق اس کے پھٹے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر میں اندر ہی اندر بہت دُکھی ہوئی.. میں نے اس بچّی سے پوچھا: "بیٹی! اس پیکٹ میں کیا ہے؟ بچّی نے معصومیت سے اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پیکٹ کو ایک نظر دیکھا اور پھر میری طرف ایک نگاہ ڈالی اور بولی:

"آنٹی! یہ آپ کی تصویر ہے نا..؟ ممّی نے کل ہی گھر کی ساری کتابیں پنساری کو دے دی تھی..."

یہ سُن کر میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی .....اب آپ ہی بتائیں اردو کے قارئین کے ذوق وشوق کے بارے میں، اردو سے اُن کی محبت، لگن اور دلچسپی کے بارے میں۔ آج کے جو مختصر قارئین رہ گئے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے لوگ بھی ہیں جن کے نزدیک اردو کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ بس ظاہری شان وشوکت

کی خاطر اردو کا تذکرہ گاہے گاہے کر لیتے ہیں۔ اگر اسی طرح ان کی لاپرواہی اور بے اعتنائی اردو سے برقرار رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ اُن کی نسلیں اردو کے نام سے بھی بے بہرہ رہیں گی.....!

بہرحال......! اگر آپ کے پاس گزشتہ رسالوں کی مزید کا بیاں رہ گئی ہوں تو برائے کرم ارسال کر دیں۔ دوسرے خط میں یں معلوم کر کے گم شدہ رسالوں کے سال اور مہینہ درج کر دوں گی...!

لیجئے......! "درندوں کی دنیا" حاضر ہے۔ یہ دنیا ایک ایسی عجیب و غریب دنیا ہے، جہاں پیار و محبت، خلوص و اخلاق اور ہمدردی یہ سارے کے سارے جذبات بے معنیٰ، پھیکے اور بے مقصد ہیں۔

نازو غربت کی ماری مگر تعلیم کے حصول کی بھوکی دوشیزہ اپنے اسکول کے فائنل ائیر کے امتحانات کی فیس داخل کرنے کے لیے اپنے ابا حضور کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرتی ہے۔ مگر اس کے ابّا کو آنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے...! غربت انسان کو آج سے نہیں صدیوں سے لاچار، بے بس اور بدنام کرتی آ رہی ہے.....!

غربت کا دوسرا نام میری دانست میں جرم ہے۔ ایک ایسا جرم جس کی تلافی غریبوں کی حیات تک ممکن نہیں! اس لیے کہ خدا بھی غریبوں کا ساتھ نہیں دیتا....!

نازو اور اس کے ابا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے..!

بھابی صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کردیں اور بچّوں کے لیے ڈھیر سی دعائیں !

آپ کی بہن

صبا حسن صدیقی

درندوں کی دُنیا

"خدا خدا کرکے دھوپ کی تمازت اب ذرا کم ہوئی ۔ خنک ہوائیں درختوں کی شاخوں اور پتّوں سے ہم آغوش ہو کر جل ترنگ بجاتی ہوئی بڑے دل کش انداز سے اپنی آمد کا لہرا لہرا کر پُر جوش اعلان کر رہی ہیں یہ سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی پوربی ہوائیں اتنی روح فزا ہیں کہ ان کی ٹھنڈک سے میرے احساسات وجذبات میں ایک ہلچل سی پیدا ہونے لگی ہے ۔ میں ان گنگناتی ہوئی معطّر ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک دُور پہاڑوں کی اوٹ میں شام اپنا سرمئی آنچل بدلنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا میں گہرا سیاہ رنگ پھیل گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" جُوں جُوں شام اندھیروں میں ڈھل رہی ہے ہواؤں کا زور بڑھ رہا ہے ۔ سامنے سمندر کی خوف ناک موجیں زور زور سے آپس میں ٹکرا کر خاصا شور مچا رہی ہیں اور ساحل سے اپنا نازک سر ٹکرانے پر مائل نظر آ رہی ہے ۔ ہر لہر کی آنکھیں جھاگ کی شکل میں اشکوں کے موتی ساحل پر بکھرا رہی ہیں تاکہ دیکھنے اور حسّاس دل رکھنے والوں کو ان کی مجبوری اور بے بسی کا اندازہ پوری طرح ہو جائے ۔"

"میرے کانوں میں لہروں کے آپس میں ٹکرا کر شور مچانے کی آوازیں

اب بھی آ رہی ہیں ..... اب بھی میں اُن کی پکار سُن رہا ہوں ۔ لیکن میری مانوس آنکھیں اُس طرف دیکھ رہی ہیں جہاں دُور ..... بہت دُور ..... تا حدِّ نظر کنارے کنارے سمندر نیلگوں آسمان سے گلے مل رہا ہے ۔ وہاں اب گھُپ اندھیرے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا ہے ۔ اس دُوری کا بھیانک منظر یہ کہہ رہا ہے کہ آج کوئی زبردست طوفان آنے والا ہے ۔ بالکل ویسا ہی طوفان جیسا پچھلے سال آیا تھا .....؟"

"پچھلے سال بھی تو سمندر کی گرج دار آوازوں نے نازو کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا ۔ سمندر کی شور مچاتی ہوئی لہروں کی زبان نے رہ رہ کر نازو کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا ۔ جب ہی تو اس نے اپنے آپ کو اس غیض و غضب آلود لہروں کے حوالے کر دیا تھا .....؟"

"آہ .....!" ان لہروں نے اپنی آغوش میں کسی ماں کی ممتا کی کی طرح نازو کو چھُپا لیا تھا ۔ ہم اب کبھی اُسے نہیں دیکھ سکتے ....."

"کاش ! یہ ایک خواب ہی ہوتا تو آج میں اس طوفان سے خوف نہ کھاتا ۔ کیوں کہ آج کی طوفانی ہواؤں کا یہ زور اور سمندر کی ان کرخت آوازوں نے میرے ذہن اور خیالات کو اس قدر جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے کہ اس کی بے چین لہریں مجھے بار بار نازو کی یاد دلا رہی ہیں اور میں نازو کو یاد کر کے اس کے تصوّر میں حواس باختہ ہوتا جا رہا ہوں ....."

"نازو کی یاد میرے لیے ماضی کا ایک ایسا بیش بہا خزانہ ہے جسے میں اپنے دل کے خانہ میں چھپائے بیٹھا ہوں ۔ وہ میرے پراگندہ تخیلات کی ہر شاہ راہ کے ہر موڑ پہ ملی اور جب بھی وہ ملی ، جہاں بھی اس سے میرا

سامنا ہوا میں اُسے بس دیکھتا ہی رہا..... کچھ کہہ نہ سکا.....''

''میں نازو سے دل سے محبت کرتا تھا۔ کرتا ہوں اور تمام عمر کرتا رہوں گا..... لیکن میں کبھی نازو سے اپنی محبت کا اظہار نہ کر سکا۔ معلوم نہیں کیوں.....؟

'' نازو کی حد درجہ شرافت، حیا اور اس کی سادگی نے مجھے ایسا کرنے پر آمادہ نہ کیا۔ اور میں بار بار کوشش کے باوجود بھی ناکام رہا..... لیکن میں اپنی اس ناکامی سے بھی مطمئن تھا کہ نازو میری ہے صرف میری! مجھے کیا معلوم تھا کہ نازو بہت جلد مجھ سے بہت دُور ایسی جگہ چلی جائے گی، جہاں سے پھر کبھی واپس نہ آئے گی۔ اور میری پست ہمتی مجھے زندگی بھر ندامت کی آگ میں جھلساتی رہے گی.....''

''میں گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی بہت غم گین اور دلگیر ہوں۔ آج کی یہ طوفانی شام میرے جذبات و احساسات میں اضطراب اور بے چینی کی کسک پیدا کر رہی ہے..... میرے زخموں پر، ناسور پر نمک پاشی کر رہی ہے۔ آج کے موسم اور طوفانی ہواؤں میں بارش کا زور... . اللہ رحم کرے..... رہ رہ کر میرا دل نازو کو پکار رہا ہے.....''

''نازو کا اصلی نام نازنین تھا۔ سب اُسے پیار سے نازو کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ میری ہمسایہ تھی۔ اور اسکول فائنل کی ایک ہونہار طالبہ تھی۔ اس کا سراپا کتنا دل کش اور انداز کتنا اثر انگیز تھا۔ اس کی حسین صورت کی معصومیت میں اس بلا کی کشش اور سادگی تھی، جو بیان میں نہیں آسکتی...''

نازو کے ابا جنھیں شہر میں سب لوگ چچا آفتاب کہہ کر پکارتے تھے

بہت مال دار اور باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کا کاروبار دُور دُور تک، پھیلا ہوا تھا۔ شہر میں اُن کے کئی مکانات، دوکانیں اور گاڑیاں تھیں۔ متعدد خدمت گار ہر وقت اُن کے چھوٹے سے خاندان کی خدمت گزاری میں لگے رہتے تھے۔"

"عیش و عشرت اور ناز و نعم میں پرورش پائی ہوئی نازو بڑی نازک اور بھولی بھالی لڑکی تھی۔ پُورے خاندان کی لاڈلی ..... اور اپنے والدین کی بے حد دُلاری تھی۔ وہ اپنے گھر کی شمعِ فروزاں تھی۔ جس کے دم سے پورے گھر میں رونق تھی ....."

"وقت گزرتا گیا۔ نازو کی پرورش اور اس کی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہ آئی اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ نازو نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اچانک وقت نے اپنے تیور بدلے اور خوب صورت سرسبز و شاداب لہلہاتا ہوا چمن آن کی آن میں ویران ہو گیا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ سب کچھ فنا ہو گیا....."

"چچا آفتاب اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک مقدمہ ہار گئے اور انھیں گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ شان دار حویلی جیسے مکان میں رہنے والوں کو نوکروں کی جھونپڑی میں پناہ لینی پڑی۔ نازو کی امّی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور ملکِ عدم کو سدھار گئیں ....."

"چچا آفتاب کہنے کو زندہ رہے اپنی بیٹی نازو کے لیے ورنہ وہ بھی کب کے اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے ....."

"نازو بہت سمجھ دار اور ہوش مند لڑکی تھی۔ اس نے اپنے تمام غموں

کو بھلا کر حالات کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے غم زدہ باپ کے غم کا مداوا بن کر انھیں تسلّی اور تشفی دیتی رہی۔ اور خود بھی زندگی کو بہت سادہ اور سہل طریقوں سے گزارنے کا ہنر سیکھ لیا۔۔۔۔"

"جب ہی نازؔ کے ابّا اپنے گزشتہ تمام غموں کو بھول کر نازؔ کی خوشی میں خوش رہنے لگے۔ لیکن جب بُرا وقت آتا ہے تو چاروں طرف نحوست کا سایہ منڈلانے لگتا ہے۔۔۔۔"

"رفتہ رفتہ اُن کے حالات بد سے بدتر ہونے لگے اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ انھیں دو وقت کی روٹی بھی ملنا اُن کے نصیب میں نہ تھی۔۔۔۔"

"دولت جب ساتھ تھی تو دنیا اُن کے پیچھے گھوما کرتی تھی۔ جب غریبی مفلسی اور بے بسی ساتھ ہو تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ کر دور چلا جاتا ہے۔۔۔۔"

"نازؔ کے ابّا کی مصیبت کے بھیانک اور آزمائش کے دن طویل ہونے لگے۔ نازؔ کو اسکول میں فائینل کے امتحان کی فیس داخل کرنا تھی۔ ہزار کوششوں کے باوجود چچا آفتاب فیس کی رقم کسی طرح فراہم نہ کر سکے۔ آج فیس کا آخری دن تھا۔ چچا آفتاب اور نازؔ بہت فکر مند اور پریشان تھے۔ اب انھیں اپنی بے پناہ مجبوری اور بے بسی کا شدید احساس ہوا۔ جب وہ ہزاروں سے کھیلتے تھے تو انھوں نے حاجت مندوں کی ضرورت عین وقت پہ پوری کی۔۔۔۔۔۔ انھیں سہارا دیا۔ لیکن آج جب کہ وہ خود زمانے کی گردشوں کا شکار ہو گئے ہیں تو انھیں آج سب نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر چچا آفتاب بہت غم گین اور ملول رہنے لگے۔"

"جب انھیں کوئی اور دوسرا راستہ نظر نہ آیا تو انہوں نے اپنی

مرحومہ بیوی کی آخری نشانی سونے میں جڑے ہوئے ہیرے جواہرات کا ایک بے حد قیمتی ہار جسے انھوں نے نازد کے لیے چھپا رکھا تھا۔ اسے بازار میں ایک سونے کی دوکان پر لے گئے تاکہ اُسے فروخت کرکے نازد کے امتحانات کی فیس ادا کی جائے۔"

"لیکن بدقسمتی جب پیچھے پڑ جاتی ہے تو بُری طرح سے انسان کو کڑھا کڑھا کر ختم کر ڈالتی ہے۔ دوکان کا سیٹھ چچا آفتاب کی مفلسی اور غریبی دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ آدمی کوئی زبردست چور ہے۔ اور کہیں سے یہ قیمتی ہار چُرا کر لے آیا ہے۔ اس نے چچا آفتاب کو ایک جگہ بٹھا کر فوراً پولیس کو فون کرکے بلا لیا۔ اور چچا آفتاب کو یہ کہہ کر پولیس کے حوالے کر دیا کہ یہ آدمی چور معلوم ہوتا ہے اور کہیں سے یہ قیمتی ہار چُرا کر لایا ہے۔"

'اتفاق سے میں ہی وہ بدنصیب اور مجبور پولیس انسپکٹر تھا جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔ سیٹھ کے فون کرنے پر جب میں اس کی دوکان پر آیا اور یہ معلوم ہوا کہ چچا آفتاب پر ایک قیمتی ہار چُرانے کا الزام ہے تو میں یہ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے سیٹھ سے بہت کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ ایسا شخص نہیں ہے، جسے آپ چور سمجھ رہے ہیں....."

"لیکن سیٹھ نے میری ایک نہ سُنی۔ اور مجھے بھی دھمکی دی کہ اگر میں نے چچا آفتاب کو گرفتار نہ کیا تو وہ میری بھی نوکری لے ڈالے گا...."

سیٹھ چوں کہ شہر میں نیا آیا تھا۔ اور اس کی کئی کروڑوں کی ہیرے جواہرات کی دوکان تھی۔ اس لیے وہ نہ تو چچا آفتاب کی بزرگی اور عظمت کو پہچان سکا اور نہ وہ مجھے جاننے اور میری باتوں کو ماننے کے لیے تیار ہوا...."

"میں اس وقت مجبور تھا۔ اور اپنی ڈیوٹی پر تھا۔ اس لیے میں نے چچا آفتاب کو اپنی جیپ میں بٹھایا اور انھیں لے کر چل پڑا۔۔۔"

"چچا آفتاب اپنی جگہ بہت سنجیدہ اور خاموش تھے۔ اُن کی بھیگی بھیگی پلکیں ان کی دلی کیفیت کی غمّازی کر رہی تھیں۔ اُن کی یہ شرافت اور خودداری تھی کہ انھوں نے اپنی صفائی میں مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اور سیدھے میرے ساتھ چلے آئے۔"

"شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ میں بھی انھیں چور سمجھ رہا ہوں جب ہی تو انھیں تھانے لیے جا رہا ہوں۔ وہ بالکل خاموش اور غمگین سے جیپ میں بیٹھے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد انھوں نے اپنی خاموشی کو توڑا اور مجھ سے گلوگیر آواز میں بولے۔۔۔"

"شیراز بیٹے۔۔۔۔! تھانے جانے سے قبل میں ایک نظر اپنی بیٹی نازو کو دیکھ لینا چاہتا ہوں۔ نازو میرا انتظار کر رہی ہوگی۔۔۔!"

"اس وقت اُن کا غم و اندوہ سے لبریز چہرہ دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔۔۔۔ میں نے اُن سے فوراً کہا:"

"چچا صاحب! آپ پریشان نہ ہوں۔۔ میرے ہوتے ہوئے آپ تھانے کی شکل کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ میں آپ کو تھانے نہیں بلکہ آپ کے گھر لئے جا رہا ہوں۔۔۔۔"

"یہ سُنتے ہی چچا آفتاب کے چہرے پر قدرے سکون نمایاں ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔۔۔ وہ کس سوچ میں مبتلا تھے۔۔۔۔ یہ کسے معلوم تھا؟"

"لیکن اتنا ضرور تھا کہ اُن کے اندر اس طرح کی ایک بے چینی تھی۔ جو انھیں سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی....."

"باہر طوفان کا سماں بالکل ویسا ہی خوف ناک تھا۔ جیپ آگے بڑھ رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر ایک غم میں مبتلا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وقت کتنا بے وفا ہوتا ہے۔ جب منہ موڑ لیتا ہے تو کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا۔ اس کی نگاہوں میں اچھے بھی بُرے بن جاتے ہیں۔"

"میں اسی طرح اپنے خیالوں کے تسلسل میں بہہ رہا تھا کہ اتنے میں جیپ چچا آفتاب کے گھر کے سامنے جاکر رُک گئی....."

"چاروں طرف گھٹا ٹوپ، اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بارش کا زور بڑھ رہا تھا..... بجلی کی چمک سے سارا ماحول سہما سہما سا نظر آرہا تھا۔ بادلوں کی جان لیوا گرج دلوں کو دہلا رہی تھی۔ فضا کا مزاج خطرناک حد تک بگڑ چکا تھا۔ شاید طوفان نے یہ تہیّہ کرلیا تھا کہ آج وہ کچھ کر کے ہی دم لیگا۔"

"چچا آفتاب طوفان کی پروا کئے بغیر ہی جیپ سے بے تحاشا اُترے، میں بھی اُن کے ساتھ اُتر گیا۔ اور ان کے ساتھ ساتھ اُن کے گھر کی جانب چلنے لگا......"

"جب چچا آفتاب اپنے گھر کے دروازے پر پہنچے تو کچھ دیر کے لیے رُک گئے۔ شاید وہ پہلے اپنے کو سنبھالنا چاہتے تھے۔ تاکہ اپنی بیٹی نازو کا سامنا کرسکیں......"

"جب وہ اپنے آپ کو سنبھال چکے تو انھوں نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ لیکن..... اندر ان کے قدم پڑتے

ہی ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ان کی آنکھیں خوف زدہ ہو گئیں اور زبان سے ایک بھیانک درد سے معمور چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرنے ہی والے تھے کہ میں نے انھیں بڑھ کر سہارا دیا اور قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر انھیں بٹھا دیا۔۔۔۔"

"سامنے کا منظر دیکھ کر میں بھی بہت حیرت زدہ اور پریشان ہو گیا۔۔۔۔ فرش پر ایک خونی منظر تھا۔۔۔۔ چچا آفتاب کے بھانجے بشیر کی لاش خون میں لت پت فرشِ زمین پر پڑی ہوئی تھی۔۔۔۔"

"یہ منظر دیکھ کر اس وقت خود میں بھی حواس باختہ ہو گیا تھا۔ میری بھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟۔۔۔۔ اور میں اب آگے کیا قدم اٹھاؤں۔۔۔۔؟"

"اس کے ساتھ ہی میں ہر چیز کو حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگا۔ میں جلد سے جلد اس المناک سانحہ کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ معًا میری نظر ایک طرف رکھی ہوئی ایک ٹیبل پر پڑی۔ جس پر کچھ کاغذات بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔۔۔۔"

"میرے ساتھ چچا آفتاب نے بھی ٹیبل پر بکھرے ہوئے کاغذات کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور کسی طرح ٹیبل تک پہنچ گئے پھر انھوں نے اپنی متحیّر نگاہوں سے تمام کاغذات کو دیکھا اور اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے تمام کاغذات کو اکٹھا کیا اور غور سے دیکھنے لگے۔۔۔۔ یہ ایک خط تھا، جسے آفتاب چچا بڑی بے چینی سے پڑھنے لگے۔۔۔۔"

"میرے اچھّے ابّو.....!"

"مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میری فیس کی رقم کہیں سے بھی نہیں ملے گی۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ آپ جیسی شخصیت کا اس دور میں کوئی پرسانِ حال اور قدر دان نہیں مل سکتا ہے.... ہو سکتا ہے کہ زمانہ ہم سے کچھ سبق سیکھے.....؟"

"اگر ایسا ہوا تو میں یہ سمجھوں گی کہ ہم برباد ہو کر بھی زمانے کو ایک یادگار سبق دے گئے۔ بہر حال! اب وقت بہت کم ہے۔ اس لیے میں اختصار سے کام لینا ضروری سمجھتی ہوں......"

"میرے اچھّے ابّو! فیس داخل کرنے کا وقت تو اب گزر گیا ہے..... وقت کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ گزر جاتا ہے تو پھر پلٹ کر نہیں آتا۔ اور پھر اب پچھتانے سے بھی کیا حاصل.....؟ میں اُداس نہیں ہوں اور نہ غم گین ہوں..... ہاں میں بے چین اور مضطرب ضرور ہوں آپ کے انتظار میں......"

"آپ نے بازار سے آنے میں کافی دیر لگا دی اور میں مسلسل آپ کے بارے میں سوچتی رہی.... باہر بارش نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک سے میرا دل دہل جاتا تھا۔ معلوم نہیں آپ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ یہ سوچ سوچ کر میری فکریں مجھے نڈھال کر رہی تھیں......"

"ہر دوسرا لمحہ میرے لیے بے قراری کا باعث بنتا چلا جاتا تھا۔ اور میں بے چینی اور اضطرابی کے عالم میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ کہ اچانک

بشیر ایک مصیبت کی طرح نازل ہوا اور مجھے اس طوفانی رات میں اکیلا دیکھ کر خوشی سے قہقہہ لگانے لگا۔ اس وقت اس کی نگاہ بہت خطرناک اور بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے اس کو دیکھ کر خوف آنے لگا اور میں اس کا بُرا ارادہ اور نیت بھانپ کر بُری طرح اندر ہی اندر کانپ گئی....“

”طوفانی رات کا یہ عالم کہ شور و غُل کے ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیروں کا بھی ہر طرف پہرہ لگ گیا تھا۔ اس وحشت ناک عالم میں میں خود کو تنہا محسوس کر کے دل ہی دل میں اللہ کو یاد کرنے لگی....“

”میں نے سوچا کمرے سے باہر نکل کر کہیں اور پناہ لے لوں۔ اس خیال کے آتے ہی جوں ہی میں نے کمرے سے باہر بھاگنے کی کوشش کی....“

”بشیر میرا ارادہ بھانپ گیا۔ اس نے زہر میں بُجھا ہوا ایک قہقہہ بلند کیا اور اپنے مضبوط بازوؤں کے زور سے مجھے اندر کی طرف ڈھکیل دیا..... میں اس کے دھکّے سے دُور جا گری..... میرے ماتھے پر کافی چوٹ آئی اور زخم سے خُون اُبلنے لگا.....“

”یہ دیکھ کر میں بُری طرح سے گھبرا گئی۔ اور میرا دماغ بڑی تیزی سے اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے لگا..... اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ بشیر اندر سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”مصیبت کا طوفان چاروں طرف سے منڈلاتا ہوا دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ لیکن جس کا کوئی نہیں ہوتا، اس کا اللہ ہوتا ہے۔ یہ بات پُورے طور پر واضح ہو گئی اور یہی وجہ تھی کہ قدرت نے میری ناگہانی مدد فرمائی اور میری نظر اچانک ایک لوہے کی بھاری سی سلاخ پر

پڑی ..... جو اتفاق سے میرے بالکل قریب پڑی ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے کچھ سکون سا سکون نصیب ہوا۔ اور میں نے عجلت اور بے خودی کے عالم میں وہ سلاخ فوراً اٹھالی اور بالکل بے اختیاری طور پر میرے دونوں ہاتھ پوری قوت کے ساتھ اس ذلیل انسان کے سر پہ پڑے ..... ''

'' میرے اچھے ابّو ..... ! پروردگار نے میری لاج رکھ لی .....

بشیر ایک خطرناک چیخ کے ساتھ بے ہوش ہو کر زمین پہ گر پڑا ...... اس کے بدن کے سارے اعضار ڈھیلے پڑنے لگے اور کسی آبشار کی طرح خون اس کے سر سے بہنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں گھبرائی نہیں۔ بلکہ مجھے ایک بھرپور سکون نصیب ہوا۔ میں یہ جانتی تھی کہ اب یہ کچھ ہی لمحوں کا مہمان ہے ..... ''

'' بہت دیر تک میں مطمئن نگاہوں سے بشیر کو اس کے اپنے ہی گناہوں کے خون میں تڑپتا ہوا دیکھتی رہی اور اپنے ربّ العزّت کا دل سے شکریہ ادا کرتی رہی ...... ''

'' یہ خط میں بشیر کی لاش کے سامنے ہی بیٹھ کر لکھ رہی ہوں۔ ممکن ہے کاغذ کے اس پُرزے پہ اس کے ناپاک خون کے دھبّے بھی آپ کو نظر آئیں... ''

'' میرے اچھے ابّو ! میں اب درندوں کی اس دُنیا میں جینا نہیں چاہتی ہوں ..... میرے سامنے سمندر کا ساحل ہے۔ اور ساحل کی بپھری ہوئی لہریں مچل مچل کر چیخ چیخ کر مجھے دعوت دے رہی ہیں ... ''

'' نازو ..... ! آ ..... تُو ہماری پناہ میں آجا۔ یہاں آکر تجھے بہت سکون ملے گا ..... پوری طرح چین نصیب ہوگا ..... ''

'' آجا ..... کہ یہاں کی دنیا صدیوں سے ایک جیسی ہے۔ یہاں

کی روش کبھی نہیں بدلی ..... نہ یہاں کے مزاج بدلے ..... نہ یہاں کے تیور بدلے ..... یہاں کسی کا اپمان نہیں کیا جاتا ..... یہاں کسی کی بے عزتی نہیں ہوتی ..... یہاں کوئی ظالم نہیں ہے..... کوئی بے رحم نہیں، یہاں آکر کوئی نہیں روتا ..... کیوں کہ یہاں کسی کی آرزوؤں اور تمنّاؤں کو کچلا نہیں جاتا ..... یہاں محبت ہی محبت ہے ..... پیار ہی پیار ہے .....''

"آ..... نازو ..... آ..... ہم تجھے پیار سے آواز دے رہے ہیں ... .. آ..... کہ ہم اپنی آغوش میں تجھے ابدی پناہ دے دیں .....''

"ابّو ..... ! میں جارہی ہوں ..... میری خدمتگذاری اور فرمانبرداری میں اگر کبھی کچھ کمی رہ گئی ہو یا کسی قسم کی کوتاہی ہوئی ہو تو مجھے معاف فرمادیں ۔ اچھا اب اجازت دیجئے ..... خداحافظ

آپ کی بدنصیب بیٹی

نازو .....''

"خط پڑھنے کے بعد چچا آفتاب کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ خط خود بخود چھوٹ کر زمین پر گر پڑا ۔ ان کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں ایک نور سا چمکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا... اُن کے لرزتے ہوئے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی....''

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُن کے سینے میں ایک طوفان بپا ہے.... درد و رنج کا طوفان ! جس کے شدید کرب سے اُن کا پورا وجود لرزنے اور کانپنے لگا..... اس کے ساتھ ہی وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئے... .. پھر آہستہ آہستہ فرش پر ہی لیٹ گئے.....''

"میں نے آگے بڑھ کر انھیں سہارا دینے کی کوشش کی لیکن

فرشِ زمین پر پہنچ کر ان کی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں......"

"میں حیرت اور پریشانی کے عالم میں کبھی بشیر کی خون میں نہائی ہوئی لاش کو اور کبھی چچا آفتاب کی بے حِس و حرکت لاش کو دیکھنے لگا..... مجھے یہ بھی پتہ نہ چلا کہ میری آنکھوں سے بھی ایک طوفان آج کے طوفان کی طرح برس رہا ہے......" ●●

○

صبا اور ان کا ادبی ذوق

کیپٹن جی۔ اے۔ مصطفیٰ

زمانہ بڑی تیز رفتاری سے آگے کی طرف دوڑ رہا ہے۔ اگر اسی تیز روی سے ہم زمانہ کا ساتھ نہ دیں تو یقیناً اس دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ اور زمانہ آگے نکل جائے گا۔..........

..... اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی کوتاہی، بے پرواہی اور غفلت کی وجہ سے اپنے کاموں کو ادھورا ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ جنہیں وہ بعد میں کوشش کے باوجود بھی مکمل نہیں کر پاتے........ اگر خوش نصیبی سے پورا کر بھی لیتے ہیں تو بڑی مشکلوں اور دقتوں کے ساتھ......!

میری اہلیہ صبا حالاں کہ اپنی تمام ذمہ داریوں کو انجام دینے کے سلسلہ میں بڑی پابندی اور فرض شناسی کا ثبوت دیتی ہیں۔ اپنا ہر کام باقاعدہ وقت پر کرنے کی عادی ہیں اور ان کا طریقۂ کار بھی بڑا ہی سائنٹیفک ہوتا ہے۔ انھیں جو بھی کام کرنا ہوتا ہے، پہلے اس

کی فہرست مرتب کرتی ہیں۔ اس کے بعد اسی کے مطابق سلسلہ وار اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتی ہیں۔ مگر پتہ نہیں کیوں صبا نے اپنے افسانوں کے ساتھ بڑی بے اعتنائی برتی ہے۔ تقریباً پچھلے دس برسوں سے وہ اپنے افسانوں کے مجموعہ "انگاروں کا شہر" کو منظرِ عام پر لانا چاہتی تھیں۔ بس خیال کرتی رہیں اور پھر خیال خیال ہی رہ جاتا تھا۔ اگر اس وقت ان کا یہ مجموعہ شائع ہو چکا ہوتا تو اب تک ان کے دو، تین اور مجموعے منظرِ عام پر آجاتے۔ مگر وہ اپنی دوسری مصروفیتوں پر ہی توجہ دیتی رہیں اور مجموعے کی اشاعت کا کام التوا میں پڑا رہا۔

خیر... خدا کا شکر ہے کہ یہ دیر سہی "انگاروں کا شہر" کی طرف صبا نے اپنی توجہ مرکوز کر دی ہے۔ حالاں کہ اشاعت میں قدم قدم پر رکاوٹیں، دشواریاں اور مشکلیں درپیش ہوتی ہیں، مگر پھر بھی "انگاروں کا شہر" کی تیاریوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ صبا نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب کچھ بھی ہو جائے "انگاروں کا شہر" کی طباعت لازمی ہے........ اور اب مجموعہ کی کتابت مکمل ہو گئی ہے........ بس پریس میں جانا باقی ہے۔..... اُمید ہے اس ماہ کے آخیر تک "انگاروں کا شہر" اشاعت و طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آجائے گا۔

صبا کے افسانوں کے مجموعہ "انگاروں کا شہر" کے تعلق سے کچھ لکھتے ہوئے مجھے یقیناً بڑا فخر محسوس ہو رہا ہے۔ اسی بہانے

مجھے یہ موقع ہاتھ لگ رہا ہے کہ میں صبا کے بارے میں بھی کچھ کہوں جو میرے احساسات ہیں، جو بھی میں نے محسوس کیا ہے اس کا اظہار کروں ۔۔۔ یہ احساسات و محسوسات اچھے بھی ہیں اور شکایت آمیز بھی۔۔۔۔۔۔۔۔ سب سے پہلے میں صبا کے کردار اور اُن کے شوق و ذوق کے بارے میں چند لائین لکھنا چاہوں گا۔۔۔۔

صبا کو فنونِ لطیفہ سے کافی حد تک دلچسپی ہے ۔ یہ دلچسپی شوق یا خواہش کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنی خواہشوں کو عملی جامہ بھی پہناتی رہتی ہیں۔ یعنی اپنے شوق کو پورا کرنے کی خاطر وہ دن رات اتنی محنت کرتی ہیں کہ کبھی کبھی انہیں دیکھ کر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ صبا کے اندر اتنا صبر، اتنی لگن اور اتنا استقلال آیا کہاں سے اور کیسے ۔۔۔۔؟ اور یہی وجہ ہے کہ میں اُن کی بے پناہ محنت و ریاضت اور بھرپور جذبات کو دیکھ کر اُن کا ساتھ دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ میں نے اوپر درج کیا ہے کہ انھیں فنونِ لطیفہ سے جنون کی حد تک رغبت ہے۔ وہ بیک وقت ایک ادیبہ بھی ہیں، مصنفہ بھی ہیں، شاعرہ بھی ہیں اور آرٹسٹ بھی ہیں اور گلوکارہ بھی! اس کے علاوہ انھوں نے فلمی آرٹ کی دنیا کا بھی رُخ کیا۔ کئی ڈاکیومینٹری فلمیں تیار کیں اور انڈمان کے آرٹسٹوں کو لے کر ویڈیو فلمیں بنائیں۔ کہانیاں خود لکھتی ہیں اور ڈائرکٹ خود کرتی ہیں وہ ایک بہت اچھی ڈائریکٹر بھی ہیں۔ کیمرہ بھی صبا خود ہی handle کرتی ہیں۔ شوٹنگ کے بعد

Process اور دوسرے پروسس Editing ، dubbing
میں بھی وہ بغیر کسی مددگار کے خود ہی ساری ذمہ داریوں کو انجام دیتی ہیں.... ان تمام مشاغل کے علاوہ صبا ایک گھریلو خاتون بھی ہیں۔
گھر کی ساری ذمہ داریاں بحسن وخوبی انجام دیتی ہیں۔ ہماری شادی کو تقریباً 24 سال ہونے کو آرہے ہیں۔ مگر مجھے صبا نے کبھی کسی قسم کی شکایت کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔.... جس سے ہمارے درمیان کبھی کوئی کشیدگی پیدا ہوتی۔ وہ باقاعدگی کے ساتھ گرہست بھی سنبھالتیں اور اپنی ادبی ذمہ داریوں کو بھی بڑے سلیقے کے ساتھ اور بڑی ایمان داری کے ساتھ انجام دیتیں۔ اپنا ہر کام وقت پر کرنا ان کی فطرت میں شامل ہے۔
حج سے آنے کے بعد اب صبا میں نماز کی پابندی بھی آگئی ہے۔ اب ہمارے گھر کا ماحول مذہبی، ادبی اور گھریلو ہے۔ ایسے ماحول میں یقیناً سکون نصیب ہوتا ہے۔ جہاں خاموشی ہو اور پیار و محبت کی فضا ہو....... جو ماحول ادب، آرٹ اور مذہب کا سنگم ہو۔ ایسی فضا مبارک اور سازگار ہی ہوا کرتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہمیں ایسا ماحول عطا کیا۔
صبا کے سَو سے زائد افسانے ہندو پاک کے مقتدر رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ صبا کے افسانوں اور شاعری سے میں بہت متاثر ہوں۔ اس لیے نہیں کہ وہ میری نصف بہتر ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ان کے افسانے سچائیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کی

شاعری اکثر ان کے دلی جذبات کی اور پھر سماج کی بھرپور عکاسی کرتی ہے

اپنے فن کے تعلق سے صبا کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ وہ جب بھی تفریح کے سلسلہ میں باہر جاتی ہیں تو راہ میں یا سفر کے دوران کہیں بھی انھیں ایسی کوئی بات یا منظر متاثر کرے تو وہ گھر لوٹ کر اُسے نوٹ کر لیا کرتی ہیں۔ اس کے بعد وہ اس تاثر یا پلاٹ کو افسانوی تشکیل دیتی ہیں۔

شروع شروع میں ایسا ہوتا تھا کہ صبا افسانے لکھنے سے پہلے مجھے پلاٹ سُنا دیا کرتی تھیں اور میری پسند حاصل کرنے کے بعد اپنے انداز میں کہانی میں ڈھال لیا کرتی تھیں۔ مگر جب سے ان کی دیگر مصروفیتیں دہری ہو گئی ہیں اور میں بھی پرواز میں کافی حد تک مصروف رہنے لگا تو ایسا موقع نہیں مل پاتا.....

اب تو افسانہ لکھنے کے بعد ہی مجھے پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

صبا کی تخلیقات خواہ وہ شاعری کی تشکل میں ہوں یا افسانوں کی صورت میں۔ جب میں انھیں پڑھتا ہوں تو مجھے اپنی اہلیہ پہ بڑا فخر محسوس ہوتا ہے۔ اس لیے کہ صبا کی تخلیقات ادبی اور تہذیبی دائرے میں مفید ہوتی ہیں، سبق آموز اور پُر تاثیر ہوتی ہیں۔ میں یہاں صبا کی بے جا تعریف نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ ان کی صحیح تصویر کشی کر رہا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ آپ بھی صبا کی تخلیقات پڑھنے کے بعد میری رائے سے اتفاق کرینگے۔

صبا نے کئی ناول بھی لکھے ہیں۔ فلمی کہانیاں بھی لکھی ہیں — مسز اندرا گاندھی پر انھوں نے ایک ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ بچوں کے لیے بھی کئی کہانیاں اُن کے پاس ہیں۔ بس وہ لکھنی چاہتی ہیں۔ مجھے ان سے اکثر

ایک شکایت رہتی ہے جو حق بجانب ہے۔ وہ یہ کہ صبا مطالعہ بہت کم کرتی ہیں اگر وہ مطالعہ بھی اسی رفتار سے کریں تو میرے خیال میں صبا کی تخلیقات کی انفرادیت اوران کے اندازِ بیان و طرز کی خوب صورتی میں اور دل کشی میں چار چاند لگ جائیں گے۔

زیرِ نظر مجموعہ "انگاروں کا شہر" کی انفرادیت اور خاصیت یہ ہے کہ صبا نے افسانوں کے ساتھ اپنے وہ مکتوبات بھی شامل کر دئے ہیں جو انھوں نے مدیرانِ رسالوں کو لکھے تھے۔ میں اکثر ان سے کہتا ہوں کہ "آپ کے مکاتیب افسانہ سے کم نہیں ہوتے" اور یہ حقیقت ہے کہ صبا کے کئی ایسے مکاتیب ہیں جو اُن کے افسانوں سے زیادہ دل چسپ اور متاثر کن ہیں۔ جب کبھی میں posting پر جاتا ہوں یا وہ جب میکے چلی جاتی ہیں تو اس دوران میں اُن کے خطوط آتے ہیں تو مجھے ان کے پڑھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ ان کے مکاتیب چوں کہ افسانوی رنگ میں ہوتے ہیں اس وجہ سے طویل ہوتے ہیں اور کبھی کبھی وہ خط میں ایسی ایسی باتوں کا بھی ذکر کر دیا کرتی ہیں جس کا تعلق خط کے مضمون سے بالکل نہیں ہوتا۔ مگر پھر بھی وہ دل چسپی سے خالی نہیں ہوتے۔ روانی میں اکثر وہ بہت سی اچھی اچھی اور کارآمد باتیں لکھ جاتی ہیں۔ اکثر وہ اپنے خطوط میں سوال پوچھا کرتی ہیں اور پھر جواب بھی وہ خود ہی دیا کرتی ہیں۔ یہی ان کے اندازِ تحریر کی انفرادیت ہے۔

اس مجموعہ میں ۱۷ افسانے شامل ہیں ان میں مجھے ذیل کے افسانوں نے بے حد متاثر کیا ۔۔۔ "صدقہ"۔ "دیوار"۔ "بہت دیر کی مہربان"

"دوسسکتی دلہن"۔ "تیسرے دن"۔ "گل جب کھلتے ہیں تو خار مسکراتے ہیں"
"درندوں کی دنیا" اور "بس اسٹاپ"۔ ....!

میں ایک ہفتہ کے بعد جب اپنی پرواز سے گھر لوٹا تو معلوم ہوا کہ مجموعہ کی کتابت مکمل ہوچکی ہے اور کل مسودہ پریس میں جارہا ہے اس اطلاع سے جہاں مجھے مسرت ہوئی وہاں پریشانی بھی ہوی، کیوں کہ عرصہ سے میں اس کے لیے اپنے تاثرات تحریر کرنا چاہتا تھا اور اب اس کے لیے ایک دن بھی پورا نہیں رہ گیا ہے۔ میں بے حد شرمندہ ہوں کہ اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے مضمون کو کل پہ ٹالتا رہا..... یہاں تک کہ مجموعہ کی ترتیب بھی مکمل ہوگئی اور میں اپنا فرض پورا نہ کرسکا۔

بہر حال.....! "انگاروں کا شہر" کے اوراق کے لیے میں بہت ہی عجلت میں جو بھی من میں آیا اپنے تاثرات کے طور پہ ظاہر کر دیا ہے۔

یہاں ایک اور بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ میری یہ خواہش ہے کہ "انگاروں کا شہر" ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہو...... تاکہ مجموعہ ہندی داں حضرات تک بھی پہنچ سکے۔ ...... اور اس کی شہرت و مقبولیت میں مزید اضافہ ہوجائے۔

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ صبا کی نیک کاوشوں اور کوششوں کو کامیابی کا درجہ عطا فرمائے...... اور ان کی تخلیقات ایک کے بعد ایک منظرِ عام پہ آتی جائیں۔ ...... اور صبا کا نام اور ان کا فن دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرکے اپنی

معراج تک پہنچ جائے ۔ آمین !!

جی ۔ اے ۔ مصطفیٰ

16-4-93

Saba Mustafa, M.A.,